ہارا ہوا ملاح

افسانچے

سرور غزالی

ہارا ہوا ملاح

سرور غزالی

افسانچے لکھنا، افسانے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے، ایسے ہی جیسے افسانے لکھنا ناول لکھنے سے زیادے مشکل کام ہے، چونکہ افسانچوں میں کہانی کو محدود الفاظ میں سمیٹنا ہوتا ہے اور سرور غزالی اس کے ماہر ہیں، اللہ نے ان کو قلم پر مکمل دسترس دی ہے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے تمام افسانچوں کو ایک کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہوگا اور اس کے لئے وہ مبارکباد کے حقدار ہیں، یہ افسانچوں کی کلیات ہے

امجد مرزا امجد
لندن
افسانہ نگار و صحافی

Harawa Huma Mallah
By Sarwar Gazali

ISBN 978-969-23576-0-9
8590717479920

افسانچے

مختصر افسانے

ہارا ہوا

ملاح

سرور غزالی

نام کتاب	ہاراہوا ملاح
مصنف	سرور غزالی
اشاعتِ اول	2023
کمپوزنگ	نغمہ تبسم
تزئین	کاشان ظہیر
تعداد	300
صفحات	143
قیمت	8 یورو / 350 روپے

ملنے کا پتہ:

Syed Sarwar Zahir

Demminer Str. 10

13355 Berlin, Germany

رہبر پبلی کیشنز برلن، کراچی

افسانچے

ہارا ہوا ملاح

انتساب

ڈاکٹر سید شاہد اقبال، گیا

اور

ارمان شمسی، ڈھاکہ

کے نام

آپ دونوں کی محبتیں اور ہدایتیں میرے لیے

مشعل راہ ہیں

ہارا ہوا ملاح

محترم/محترمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہارا ہوا ملاح

آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر

بصد خلوص

سرور غزالی

فہرست

ارمان شمسی

ارمان شمسی ۲۰۰۶ء میں اپنی دوسری کتاب کا اجراء کر چکے تھے اور عرصہ دراز سے قلم قبیلہ کے بہت سرگرم رکن تھے۔ لیکن میری شومئی قسمت کے مجھے اِن سے، اِن کی کتابوں کے ذریعہ ۲۰۱۰ء میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سب سے پہلے تو انکا ایک مختصر سا تعارف رسالہ شاعر میں چھپا اور پھر میں نے ان سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ عرض کیا اپنی کتابیں عنایت کر دیجئے۔ پھر مجھے ان کی چار کتابیں، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج''، ''پیاسی ندیا''، ''خواب ریزے'' اور تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ''شناخت'' ارمان شمسی صاحب کی مہربانی سے موصول ہوئیں۔ سنِ اشاعت کی ترتیب سے میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔

یوں تو ارمان شمسی کی سبھی کتابوں میں مجھے کہیں نہ کہیں ایسا لگا کہ مجھے میری متلاشی جستجو کو قرار مل رہا ہے۔ مگر تشنگی پھر بھی باقی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ ارمان شمسی بہت محتاط انداز میں کہانیاں لکھ رہے تھے۔ لیکن ان کی کتاب ''شناخت'' پڑھ کر میری جستجو کے ایک حصے، یعنی ہمارے چلے آنے کے بعد کیا ہوا، کو واقعی قرار آ گیا۔ یہ جاننا ایک الگ تشنگی کا موجب تھا۔ اور جان کر بے قراری مزید بڑھ گئی۔

ارمان شمسی کی کہانیاں یہیں کہیں ہمارے آس پاس جنم لیتی ہیں، آس پاس ہی اپنے محرک اور انجانے موڑ تلاش کرتی ہیں اور پھر ایسا لگتا ہے کہ بالکل آپ کے سامنے کسی واقعہ کی صورت میں اپنے اختتام کو پہنچ گئیں۔

کہانی کا مکمل تصور، جامع پلاٹ، منظر کشی پر دسترس اور کرداروں کے مکالمے پر اختیارِ کل اور ان میں برجستگی، ارمان شمسی کے پاس افسانہ نگاری کے ایسے اوزار ہیں اور ان کے استعمال میں ارمان شمسی اپنی پہلی کتاب سے لیکر تازہ ترین افسانوں کے مجموعے کی اشاعت کے دوران اس حد تک قدرت پا چکے ہیں کہ درحقیقت وہ صرف ایک افسانہ نگار نہیں بلکہ ایک نقاش، ایک سنگتراش بن چکے ہیں۔ وہ کہانیوں کی صورت میں پتھروں کا جیتا جاگتا مجسمہ تیار کرتے ہیں جسے آپ چھو کر محسوس کر سکتے ہیں، دیکھ کر ان کی صناعی پر عش عش کر سکتے ہیں۔ اور یہی نہیں ان کا تیار کردہ مجسمہ بولتا بھی ہے آپ سے مکالمہ کر رہا ہے۔ درحقیقت وہ افسانہ نگاری کے پردے میں مصوری، سنگتراشی اور جسمہ سازی بہ یک وقت کر رہے ہیں۔

۔۔۔۔اور ڈاکٹر سید شاہد اقبال سے ذاتی طور پر ملنے کا شرف مجھے اب تک حاصل نہیں ہوا ہے۔مگر ان سے ٹیلیفون پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔اس بات چیت میں ان کے بارے میں کم ہی گفتگو ہو پاتی ہے۔

ان کا آبائی وطن مہدانواں، منیر شریف ضلع پٹنہ ہے۔بہار سے مجھے اس بات سے خاص اُنسیت ہے کہ ہمارے آباواجداد اسی سرزمین میں پیوند خاک ہیں۔شاہد اقبال کے جدامجد، بہار کے ایک صوفی بزرگ، حضرت امام تاج فقیہ کے زمانے میں منیر شریف (بہار) تشریف لائے تھے اور اطرافِ منیر شریف (مہدانواں) میں سکونت پذیر ہوئے۔شاہد اقبال کی پیدائش ۷اِاپریل سن ۱۹۵۷کو بہار میں بمقام قاضی محلّہ آرا شہر، (نانہال) میں ہوئی۔ والد مرحوم سید زین الحق رحمانی تھے۔ابتدائی تعلیم مولانا ذاکر حسین خاں رانی ساگری کے سامنے مکتب ہو جانے کے بعد جناب عبدالرؤف غازی پوری اور مولانا سید شاہ نعمت امام قادری پھلواروی سے حاصل کی۔اور تعلیمی میدان میں ترقی کرتے کرتے مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا سے ۱۹۸۳ میں اردو میں ایم اے کیا۔اگلے سال ہی اسی یونیورسٹی سے فارسی میں بھی ایم اے کر ڈالا۔اس کے بعد سن ۱۹۸۵ میں رانچی یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا۔اور ۱۹۸۸ میں مگدھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔اس سلسلے میں بعنوان عشرت گیاوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ اپنی ڈاکٹریٹ کی تھیسیز میں پیش کیا۔اس کے نگراں پروفیسر سید محمد محفوظ الحسن قادری تھے۔

تکمیل تعلیم کے آخر میں شاہد اقبال قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نیو دہلی کی نگرانی میں قائم اردو۔انگریزی ڈکشنری پروجیکٹ (پٹنہ) میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ریسرچ افسر متعین ہوئے (سن ۸۵ تا ۸۶)، جس کے سربراہ (نگراں) پروفیسر سید محمد حسنین (م ۱۹۹۹) تھے۔اور پھر خدابخش لائبریری میں ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوگئے۔اس کے بعد رضا ہائی اسکول پٹنہ میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔اسی دوران روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ کے نائب مدیر بھی رہے۔پھر سن ۹۴ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بہ حیثیت لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔سن ۹۱ تا سن ۹۴ آپ بہ حیثیت ممتحن ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ سے منسلک رہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں بطور گیسٹ اردو لکچرار (کونسلر) بہار کے اسٹڈی سنٹر گیا میں متعین رہے ہیں۔درس و تدریس ان کا پیشہ ہے اور گورنمنٹ ہائی اسکول ھسپورہ اورنگ آباد ر بہار میں آپ بطور سینئر استاد متعین ہیں۔

شاہد اقبال بہار کے ایک ماہر تحقیق نگار ہیں انہیں تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری سے خصوصی دلچسپی ہے۔تحقیق اور تحقیق کا مرکز بہار شاہد اقبال کی سب سے بڑی خواہش اور کاوش دونوں ہی ہے۔وہ خود کہتے ہیں کہ ’’میری تحقیق بہار کے چیدہ چیدہ گم شدہ بزرگوں، صوفیوں اور لکھاریوں کے لیے وقف ہے۔بہار کے لیے، بہار پر، بہار سے متعلقہ شخصیات، بہار کے اندر یا بہار کے باہر‘‘۔

اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کے لیے شکریہ
غفار بھائی کا جنہوں نے طباعت سے آراستہ کیا
حسین بھائی کا جنہوں نے سرورق کی تزین کی
امجد بھائی کا جنہوں نے مفید مشورے دیئے اشاعت
سے قبل اور لندن سے اشاعت کا اہتمام کیا
جمیل بھائی جان کا جنہوں نے اس کی پہلی حتمی کاپی کو
پڑھ کر اسے اشاعت کا پروانہ دیا
نغمہ کا جنہوں نے کتابت، پروف ریڈنگ اور کہانی کے
چناؤ کے مراحل میں شانہ بشانہ مدد کی
کاشان کا جنہوں نے کمپیوٹر کی مدد فراہم کی

پیش لفظ

دروازے کے جھروکے سے امید کی کرن لہرائی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دروازے پر کوئی خوشی ہولے ہولے دستک دے رہی ہو۔

میں نے آگے بڑھ کر مسرت بھری سوچ میں دروازے کے پٹ وا کر دیئے۔۔۔۔جھانک کر باہر کی طرف دیکھا تو ہر سو تنہائی کا سناٹا ہی محسوس ہوا۔

یہ میری سوچ ہے جسے میں حقیقت کے روپ میں دیکھنے کی خواہش میں ایسا کر رہا ہوں ورنہ خوشی کا ہر بار دروازے پر دستک دینے کا احساس دراصل میری عادت بن چکی ہے۔ناکامی اور نامرادی کے دو عفریت جب تک میرے دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں تب تک خوشیوں کا اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔

اسے خطبہء جمعہ سے نہیں، نا۔۔۔۔گناہِ کبیرہ، ویزا، عادی چور، کوئی روگ، دفعہ ۱۴۴ بھی گٹر کا ڈھکن بھی ہٹا نہیں سکتا۔نہ ضرورت رشتہ، فٹ پاتھ، حلال، قابلِ اعتراض اس کی حالت بدل سکتے ہیں۔ کوئی پالش والا صاحب، یا نیلو، گورکن، کنڈکٹر کیا کرے گا۔اسکول کا بستہ، بل فائیٹنگ، مفاد کا ٹکراؤ، سورج کا اغوا، غیرت مند بے غیرت، سکندرِ اعظم، ہارا ہوا ملاح ڈوبتی کشتی کو پار نہیں لگا سکتا۔ بیہودہ کتا، کرامت، جھولا، رائمسس دوم، قندیل جنت میں، روشن خیالی، حلال گوشت، استاد شاگرد، کوئی نصاب بدل کر، سانجھے کی بیوی کو آسام کی شہریت دے کر اجنبی، بچے کی شکایت سن کر، لگان دے کر غزا کی ہار جیت سے لکم دینکم کی ورد سے نہیں بدلا جا سکتا۔

شاہ بلوط کا پرانا پیڑ اپنی جھولتی شاخوں سے برسوں پرانی کہانی سناتا رہتا تھا مگر اس کے سائے میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس سے کہانی سننے کو تیار نہ تھے۔وہ اسے مجنوں کی بڑ سمجھتے تھے حتیٰ کہ شاہ بلوط بھی اب خاموش ہو گیا تھا۔

(۱)

جوائنٹ فیملی سسٹم

شہد کی کمی سے شہر میں اصلی شہد کی قیمت بہت بڑھ چکی تھی۔اور پھر بھی قدرتی طریقے سے شہد کی مکھی کے چھتے سے حاصل شدہ شہد نایاب تھا۔مصنوعی طریقے سے جار میں میٹھے شیرے پر بھنبھناتی مقید شہد کی مکھیاں شیرے کو شہد میں بدل دیتیں۔۔۔۔۔۔۔

پھولوں پر جاکر رس چوس کر شہد بنانا،شہد کی مکھیوں نے چھوڑ دیا تھا۔شہد کی مکھیاں جو آزاد فضا میں گھوم رہیں تھیں۔انہوں نے انسانوں کی دیکھا دیکھی 'جوائنٹ فیملی سسٹم' کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

(۲)

جنگلی فیصلہ

جنگل میں کانفرنس ہو رہی تھی۔تمام جانور اس بات پر متفق تھے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ انسانوں نے ہمیشہ ہی جنگل اور جانوروں سے بُغض رکھا اور انہیں ختم کرنے میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔۔۔۔۔۔مگر پھر بھی اب جبکہ وہ مصیبت کے مارے اپنی بستیوں سے بھاگ کر جنگل آئیں تو ہم کھلے دل سے انہیں قبول کریں گے۔۔۔۔اور چڑیا گھر جیسے انسان گھر نہیں بنائیں گے۔

(۳)

قربانی کی کھال

مویشی منڈی میں دونوں باپ بیٹوں کی نظریں خوبصورت اورتوانا بکرے کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔۔۔۔۔

ان کی نظریں قربانی کے جانوروں کی کھال پر تھیں۔۔۔۔

منڈی میں جانوروں کے سوداگروں کی نظریں آتے جاتے گاہکوں میں سے خوبصورت سفید کھالوں والے بڑے تن وتوش کے افراد کو تلاش کررہی تھیں۔۔۔۔

منہ مانگے دام تو ایسے ہی کھال والوں سے مل سکتے تھے۔

۞۞۞

(۴)

ویران حویلی

''**مکان** کرایے پرنہیں دیا جاتا ہے ہاں البتہ تم ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہوتو آجاؤ۔۔۔۔

مگر پہلے ہماری طرح کے سفید لباس پہن کر آؤ۔۔۔''

لڑکے کے سوال پر، بڈھے نے کھرکھراتی آواز میں اُس نوجوان سے کہا۔۔۔

لڑکا وہاں مکان کی تلاش میں آیا تھا، مگر بڈھے کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ شاید برسوں پہلے قبر میں لٹایا گیا ہواور ابھی اٹھ کر آ گیا ہے۔

بازار میں سفید کرتا پاجامہ خریدتے ہوئے دکان دار نے اس سے پوچھا کوئی خاص موقع ہے۔

لڑکے نے بتایا کہ وہ گاؤں کے سرے پر کھڑی حویلی کا مکیں بننے جارہاہے۔

''پھرتم یہ دس گز لٹھا لے جاؤ۔۔'' دوکان دار بولا۔۔''وہاں تم کرتے پاجامے میں نہیں رہ سکتے ہو۔''

لڑکا لٹھا لیکر چلا گیا حویلی کے قریب اس نے لٹھے کو کھول کر دیکھا تو اس میں اسے ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا۔۔۔

وہ دوکان کی طرف پلٹا اور بازار پہنچ کر دکان تلاش کرنے لگا۔۔۔۔۔اسے دکان نظر نہ آئی تو وہ پریشان ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔۔۔۔۔پھر وہیں ایک ہوٹل والے سے پوچھا کہ بازار میں جو بزاز کی دکان تھی وہ کہاں ہے۔۔۔۔

بزاز کی دکان۔۔۔۔ہوٹل والے نے حیرانی سے کہا۔۔۔

گاؤں کے بازار میں کپڑے کی کوئی دکان نہیں ہے۔سب لوگ شہر جاتے ہیں کپڑے لینے۔۔۔۔۔

لڑکا ہکا بکا ہوٹل والے کا منہ تک رہا تھا۔۔۔پھر لٹھے کے تھان پر نظر جمائے وہاں سے خاموشی سے کھسک گیا۔

(۵)

اسپیڈ بریکر

کراچی کے اسپیڈ بریکر کے فوائد پر غور کرتے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ناپیدان سڑکوں کے سینوں پر مونگ دلتے اسپیڈ بریکر کے فوائد کیا ہیں اسی دوران جب کئی ایک گاڑیاں اس طرح گزریں کہ ان کے سامنے کے دوپہیے ایک اسپیڈ بریکر پر اور پیچھے کے دونوں پہیے دوسرے پر تھے۔ایسے میں گاڑی کے اندر موجود کسی حسین پیکر کو جی بھر کر دیکھا جا سکتا تھا۔ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ واہ کیا کام کی چیز ہے۔آنکھیں سینکنے کو اور کیا چاہیے کہ سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں ایک خیال کوندا۔۔میں آگے بڑھ کر کسی دوسری آتی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔جیسے ہی گاڑی دو اسپیڈ بریکر کے درمیان رکی۔۔۔میں نے اپنے نیفے میں چھپائے پستول کو نکال کر گاڑی کے اندر کھڑکی کی جانب جھکے سر کی کنپٹی پر رکھ دیا۔۔۔۔۔آج میں یکے بعد دیگرے دو اسپیڈ بریکر کی موجودگی کی افادیت اور اور اس افادیت کو کیش کرنا سیکھ گیا تھا۔

❁❁❁

(۶)

دفنانے کی رسم۔۔۔

نماز جنازہ قبرستان کے احاطے میں ہی ہوئی۔اس بعد سب نے مل جل کر جنازہ اٹھایا۔۔۔چندقدم فاصلے پر ہی قبر کھود کر تیار کر دی گئی تھی۔

مردے کو دفنانے کے لیے قبر میں اتارنے کے لیے مولوی صاحب نے قریبی رشتہ داروں میں سے کسی دو کو قبر میں اترنے کے لیے کہا۔۔۔۔ لوگ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کافی پس وپیش کے بعد دو چھوٹے بچے آگے آئے اور قبر میں اتر کر مردے کو قبر میں اتارنے لگے۔ لٹا کر مردے کے منہ کو قبلہ رخ کر کے دونوں باہر آ گئے۔

مولوی صاحب نے دعا کی اور پھر مجمعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے اب آپ مردے پر مٹی ڈال سکتے ہیں۔۔۔۔۔

اتنا سننا تھا کہ مجمع جو کہ اب تک ساکت تھا ایک دم متحرک ہو گیا۔۔۔ لوگ آگے پیچھے مٹی ڈالنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ بیلچے اور پھاوڑے سے لوگ اس شدت اور گرمجوشی سے مٹی ڈالنے میں سرگرم تھے جیسے وہ مردے سے اپنا پرانا حساب چکا رہے ہوں۔

اس نے خاموشی سے دونوں ہاتھوں سے مٹی اٹھا کر قبر میں ڈالتے ہوئے سوچا کہ کیسے اپنے عزیز دوست کو منوں مٹی میں دفن کر دوں۔۔۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے اور مٹی قبر سے باہر ادھر ادھر گرنے لگی۔

(۷)

پیاسا سیلاب

وہ سیلاب سے جل تھل ریگستان میں اپنے خشک پیاسے ہونٹوں پر پڑتی پپڑی کو زبان سے تر کرنے لگا ہی تھا کہ ایک نئے سیلابی ریلے سے ڈوب کر مر گیا۔۔۔

(۸)

اپناسائبان

رینو مٹی میں کھیلتے ہوئے کڑکتے بادل کی گرج سے خوفزدہ ہوگئی،ایک چیخ مار کر دوڑی اور روٹی پکاتی ہوئی ماں کے پیچھے سے گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ لگ گئی۔

"مٹھو،اری اٹھ نگوڑی کب سے کہہ رہی ہوں کہ بچوں کو لے کر گھر کے اندر جا۔۔۔بادل گرج رہے ہیں تیز آندھی اور بارش آنے والی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

ماں قریب بیٹھی، مٹی کے گھروندے بناتی بڑی بیٹی سے بولی۔

"چھوڑو بھی اماں" مٹھو تنک کر بولی" تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ہمارے گھر کی چھت پختہ ہے اور ہم سب کو بارش میں پناہ دے گی۔۔۔۔ارے اماں ٹپکتی چھت سے تو بہتر یہ کھلا صحن ہی ہے۔۔۔کم از کم بارش میں بھیگ کر نہانے کا تو مزہ ملے گا۔۔۔۔"

سیلاب کے ریلے میں ٹپکتی چھت کی کٹیا بہہ چکی تھی۔۔۔

بڑی مشکلوں سے ماں تینوں بچوں کے ساتھ پانی کے بہاو میں بہتے بہتے قریبی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ کر آنیوالی مدد کی آس لگائے بیٹھی اس ٹوٹی پھوٹی چھت والی کٹیا کو یاد کر رہی تھی۔۔ٹپکتا ضرور تھا مگر تھا تو اپنا سائبان۔۔۔۔

(۹)

مکافاتِ عمل

"**سنو**" ٹیلی فون پر تین ستارہ ہوٹل 'ان' مالک نے اپنے مری میں واقع دوسری برانچ ہوٹل میں متعین منیجر کو بتانا شروع کیا۔

ہمارا مالم جبہ کا خوبصورت ترین ہوٹل سیلاب کے ریلے میں یوں بہہ گیا جیسے وہاں پر اس کا وجود ہی نہ تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔یہ کیا غضب ہوگیا" منیجر نے ٹیلی فون کی دوسری جانب تقریبا" چیختے ہوئے کہا۔۔۔

"تم ٹھیک کہتے ہو! اس غضب کو تم نے پچھلے سرما میں ہی تو دعوت دی تھی جب ٹھٹھرتے ہوئے سیاحوں کو منہ مانگے ، اصل سے چار گنا زیادہ کرایہ پر بھی کمرے نہ دے کر انہیں اپنی اپنی کار میں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔۔۔۔۔"

"مم میں نے سر میں نے تو صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی"۔۔۔منیجر ممنایا۔۔۔

"ہاں کاش تم نے میرا حکم بجالانے کے بجائے حکم خدا کی عدولی میں میرا ساتھ نہ دیا ہوتا۔۔۔ مالک نے کہہ کر فون پٹخ دیا۔۔۔

(۱۰)

عالینا

"ماں یہ میرے بچپن کی ساتھی ہے"
بیٹا اپنی دوست کی دفاع میں بولا۔۔۔۔۔
"میں شادی تو صرف اسی سے کروں گا۔۔۔۔۔
''تجھے پیدا مگر میں نے کیا تھا۔ یہ بھول گیا ہے تو شاید۔۔۔۔" ماں نے کہا۔
"نہیں ماں میں بالکل نہیں بھولا بلکہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب تو مجھے دن بھر کے لیے کنڈر گارٹن میں ڈال کر چلی جاتی تھی تو آلیناہی میری ڈھارس اور میری غمخوار ہوا کرتی تھی۔۔۔ماں یہ میری تب سے دوست ہے۔" بیٹے نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پاس کھڑی کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چل دیا۔۔

(۱۱)

پاس ورڈ

وہ چلتے چلتے ایک بڑے سے مکان کے آڑ میں رک گئی۔اسے یہاں تیز پُر تپش دھوپ میں نہ صرف سایہ میسر تھا بلکہ وہ اس مکان کا وائی فائی پاس ورڈ معلوم کر چکی تھی اور یہاں سے آن لائن ہونے کا فائدہ بھی اٹھا رہی تھی۔ پاس ورڈ کا معلوم کرنا اس کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔وہ

گزشتہ ہفتے سے اس گلی کا چکر لگا رہی تھی۔ پھر موقع ملتے ہی اس نے اس گھر سے سودا سلف لانے کے لیے نکلنے والے کسی بچے کو قریبی کریانہ کی دکان پر ایک آئس کریم دلوادی اور باتوں باتوں میں اپنا موبائل اسے تھما دیا اور بچے نے بے دھیانی میں اس کے موبائل پر اپنے گھر کا وائی فائی پاس ورڈ ٹائپ کر دیا۔ آج بھی وہ مزے سے یہاں ستانے کو رکنے کے بہانے یہاں کا وائی فائی استعمال کر رہی تھی۔ اسی مکان کے ٹھیک اوپری منزل پر مقیم عاصم نے جو دو تین دنوں سے اپنے کمرے میں بیٹھا کھڑکی سے اس لڑکی کو تاڑ رہا تھا۔ یہ فرض کر بیٹھا تھا کہ وہ لڑکی ٹیلی فون کرنے کے بہانے یہاں صرف اس کی خاطر دو تین دنوں سے آ رہی ہے، اور وہ شاید اسے پسند کرنے لگی ہے۔ یوں ایک خاصے بوسیدہ اور پرانے طرز کا، یک طرفہ عشقیہ سلسلہ ایک جدید دور کی جدید سہولت وائی فائی کے غلط استعمال کے نتیجے میں پروان چڑھنے لگا۔

''اونہہ بڑی آئی ہے۔'' لڑکے نے دل میں سوچا ابھی تو میں کئی دن تک بے اعتنائی برتوں گا اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ لڑکے کی بے پرواہی کا لڑکی کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ بغیر کسی کی مداخلت کے پرسکون طریقے سے اپنی سہیلی سے چیٹ کرتی رہتی اور تازہ ترین سیلفی کا تبادلہ ہوتا رہتا۔

''تو کہاں کھڑی ہے رے۔۔۔'' ایک دن اس کی سہیلی نے اسے چھیڑا۔ اور یہ گلفام شہزادکون ہے جس کے پاس تو کھڑی ہے۔ تو لاکھ مجھ سے چھپا مگر آج تو تیری چوری پکڑی ہی گئی۔ تو آج کل کس کو پھانس رہی ہے۔'' اس کی سہیلی بولتی ہی چلی گئی اور وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھی اور لگی پھر اپنی سہیلی کو اپنی جانب سے بھیجی گئی سیلفیاں ٹٹولنے۔ واقعی اسے یہ معلوم نہ تھا، کہ عاصم اوپر کی منزل سے بہانے بہانے سے کھڑکی پر آ کر اسے نیچے تکتا رہتا تھا اور وہ نادانستہ طور پر اپنی سیلفیوں میں ایک چہرہ محفوظ کیے اپنی سہیلی کو بھیجے جا رہی تھی۔

گلی میں یوں تو سناٹا ہی رہتا تھا۔شاذ و نادر ہی کوئی آتا۔ورنہ صبح صبح لوگ اپنے اپنے کام اور اسکول وکالج کو نکل جاتے تو دن دو پہر تک یہاں ہُو کا عالم ہوتا۔مگر ایسے میں عاصم کے سامنے والے مکان سے عاصم کی منہ بولی خالہ چپکے چپکے ان دونوں کی بے خبری میں سب کچھ نوٹ کر رہی تھیں۔آخر کار ان سے نہ رہا گیا اور وہ عاصم کے گھر اس کی امی سے ملنے چلی گئیں۔

ہر روز کی طرح وہ اس دن بھی آئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔جب اس نے موبائل نکال کر آن لائن جانے کی کوشش کی تو۔موبائل 'غلط پاس ورڈ' کے جواب کے ساتھ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔اس نے سوچا میں نے جلد بازی میں شاید غلط پاس ورڈ ٹائپ کر ڈالا ہے۔اس نے دوبارہ آہستہ آہستہ احتیاط سے پاس ورڈ موبائل فون کی اسکرین پر ٹائپ کیا۔مگر بے سود،وہ جھنجھلا کر سوچنے لگی۔یہ کیا ہوگیا۔وہ تھوڑی پریشان سی لگ رہی تھی۔

میصم نے موبائل تو دلا دیا تھا مگر وائی فائی وہ اپنے گھر یا اسکول میں نہیں استعمال کر سکتی تھی۔دونوں جگہ موبائل چھن جانے کا خطرہ تھا۔اف اف۔۔۔یہ ان لوگوں کو پاس ورڈ تبدیل کرنے کی بھی عجیب عادت ہے۔اب بھلا شوقینوں کا کیا بنے گا ایسے میں۔ یہ سوچ کر وہ وہاں سے چل دی۔

''ہونہہ اب مجھے کل سے کسی اور گلی میں کسی اور مکان کے زیر سائے کھڑا ہونا پڑے ہوگا۔۔۔'' اس نے سوچا اور پھر دل ہی دل میں سیلفی میں بے خیالی سے آجانے والے عکس، جس کا نام اسے معلوم نہ تھا کو کوسنے لگی۔عاصم کی امی نے اسے جاتا دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ شکر ہے اب عاصم پورے دھیان سے امتحان کی تیاری کرے گا۔وہ بڑبڑائیں۔

(۱۲)

مجبوری

نذرل اسلام انتہائی شستہ بنگالی میں اس فوجی سے مخاطب تھا۔
''تم ہمارے دیس میں کیا لینے آئے ہو۔جاؤ ہماری جان چھوڑو''۔۔۔
وہ اور بھی جانے کیا کچھ بولتا رہا۔
فوجی کے پلے کچھ نہیں پڑا۔فوجی نے انگریزی زبان میں اتنا ہی کہا ''تمہارادفاع''
''ہوں! '' نذرل نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔
اس لمبے چوڑے گورے چٹے فوجی کے سامنے منحنی سا نذرل۔۔۔۔۔اس کی شخصیت کافی دبی دبی لگ رہی تھی۔مگر وہ فوجی سے ذرا بھی مرعوب نظر نہ آتا تھا۔
طوفانی رات تھی۔بجلی کی گرج چمک میں یکدم موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔نذرل نہ صرف اچھا تیراک تھا بلکہ اسے اپنے آبائی علاقے کی بھی خوب پہچان تھی۔ وہ جلدی جلدی ایک طرف کو نکل گیا۔
فوجی پریشان حال ادھرادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا اور آخر کار مٹی کے ایک تودے کے سر کنے سے گر پڑا۔اس کے سر پر چوٹ لگی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ پانی کے بہاؤ سے بہتا بہتا قریب کے سمندر تک جا پہنچا۔۔۔۔
جہاں مچھیروں نے اسے بچالیا۔اور پھر اسے پڑوسی ملک کی بحری سمندر کی محافظ پولیس لے گئی۔

پڑوسی ملک میں علاج معالجہ ہوتا رہااور پھر وہاں سے اس کے ملک واپس بھیج دیا گیا۔
اپنے ملک میں بھی اسکا کچھ عرصے تک علاج ہوتا رہااور ایک دن وہ پھر سے جی کڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔اسکا زخم بھر چکا تھااور توانائی واپس آ چکی تھی۔ پھراس کی پوسٹنگ سبی ہوگئی۔
سبی کے قریب ہی پہاڑوں پراس کا دستہ برسرِ پیکار تھا۔رات کے اندھیرے میں آنکھ مچولی ہوتی۔دوقدم آگے اور دوقدم پیچھے۔۔۔۔بس ہر روز یہی ہوتا۔نہ فتح ہوتی نہ شکست۔۔
ایک دن وہ بازار میں دوسرے فوجیوں کے ساتھ پہرادے رہا تھا۔ادھرادھر ٹہلتے وہ ذرا آگے نکل آیا۔۔۔اچانک ایک لحیم شحیم ، بڑی بڑی گھیر والی شلوار پہنے ایک شخص نے اس کے بالکل قریب آ کراپنی مادری زبان میں اس سے کچھ کہنا شروع کر دیا۔
فوجی کے کچھ پلے نہ پڑا۔ڈر کے مارے جواباًاس نے انگریزی میں چیخ کر کہا ''بھاگ جاؤ۔۔ مجھے گولی چلانے پر مجبور نہ کرو!''
شور سن کراس کے فوجی ساتھی اور بہت سارے دوسرے لوگ جمع ہو گئے۔
انہی میں سے ایک نے ترجمانی کر کے فوجی کو بتایا کہ وہ بلوچی زبان میں کہہ رہا تھا کہ
''تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔۔ہمیں فوجی ٹرک اور اسلحے کے بجائے نوکریاں اور گھر چاہیے۔''
ایک دن فوجی یہیں ایک فوجی آپریشن کے دوران زخمی ہوگیا۔
جب وہ دوبارہ روبہ صحت ہوا تو اس کی پوسٹنگ سوات ہوگئی۔
سوات شہر کے قریب ہی اسکا اپنا آبائی گاؤں تھا۔
مگر اسے اپنے گھر والوں سے ملنے جانے کی اجازت نہ تھی۔اسکا علاقہ ''مخدوش علاقے'' کے زمرے میں آتا تھا۔
فوجی آپریشن کے دوران وہ ساری باتیں سمجھ جاتا۔

لوگ اسی کی زبان میں احتجاج کرتے۔۔

اسکا بھی خون کھولتا۔مگر وہ چاہتے ہوئے بھی فوج سے استعفی دینے سے قاصر تھا۔

❁❁❁

(۱۳)

موردِالزام

آپا ! اپنی ازدواجی زندگی سے کبھی خوش نہ رہیں تھیں۔انہیں بھائی صاحب سے ہمیشہ ہی شکایت رہی۔اور بقول آپا کے، کہ بھائی صاحب نے تو انہیں سہاگ رات ہی یہ کہہ کر دہلا دیا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہیں۔

تھوڑی دیر بعد عقدہ کھلا کہ وہ تو محض مذاق کر رہے تھے۔بھائی صاحب کی پہلی شادی انکے کہنے کے مطابق ان کی سرکاری نوکری سے ہو چکی تھی۔

بھائی صاحب کہتے۔

''اتنی اونچی پوسٹ پر اپنی ساکھ قائم رکھنا۔۔سرکار سے اتنی موٹی تنخواہ وصول کرنا۔۔سب کچھ بہت مشکل کام ہے۔

اور اسی لئے انہیں بہت محتاط طریقے سے اور بہت محنت سے نوکری کرنی پڑتی ہے۔''

شاید بھائی صاحب ایک ایماندار سرکاری افسر تھے اسی لیے۔

آپا کو بھائی صاحب کے آئے دن کے دوروں اور دفتر میں ہونے والی میٹنگوں سے بھی خاصی چڑ تھی۔

حالانکہ بھائی صاحب اپنے وعدے کے مطابق، نوکری کے بعد سارا وقت آپا کو دیتے ۔اور آپا اپنی اس سوکن، یعنی نوکری سے ہونے والی ساری آمدنی کی بلاشرکتِ غیرے مالک بن بیٹھی تھیں۔
لین دین خرچہ سب کچھ ان کے اختیار میں تھا۔نوکر چاکر کی بھر مار تھی۔جن کو رکھنا یا نکالنا صرف آپا کی مرضی سے طے ہوتا تھا۔
بھائی صاحب دفتر میں حالی موالی میں گھرے رہتے۔سکریٹری اور کلرکوں سے جواب طلب کرتے۔مگر گھر آتے ہی بھیگی بلی بن جاتے۔
آپا ان سے دن بھر کی تفصیل لیتیں۔میٹنگوں کا احوال پوچھتیں۔۔۔۔کوئی نئی خوبصورت سکریٹری تو دفتر نہیں آرہی۔۔کھوج لگاتیں۔
آپا کی شکایت جب بہت بڑھ گئی اور شکایت بد دماغی میں بدل گئی۔تو بھائی صاحب بھی عمر کے اس حصے میں آچکے تھے کہ وہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیتے۔
حالانکہ وہ ابھی کئی سال اور کام کر سکتے تھے مگر انہوں نے سوچا چلو گھر پر رہیں گے، سیر سپاٹے کرینگے، یوں ان کی چہیتی بیگم کا موڈ بھی اچھا رہے گا۔ایماندار سرکاری افسر تھے اسی لیے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست بھی فوراً منظور ہوگئی۔لیکن۔۔۔آپا جلد ہی اکتا گئیں۔۔
بھائیوں سے کہنا شروع کر دیا۔۔۔"تمہارے بھائی صاحب تو دفتر میں بھلے تھے۔دن بھر گھر میں پڑے رہتے ہیں۔کاہل ہوگئے ہیں۔انہیں کوئی کام دلوادو۔۔" بھائیوں کا ناک میں دم کر دیا۔تب بھائی صاحب نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر خود ہی ایک پرائیویٹ نوکری پکڑ لی۔
ظاہر ہے نوکری ان کے شایانِ شان نہ تھی۔
پھر عمر کا بھی کچھ تقاضا تھا۔۔دل کا دورہ پڑا۔۔۔جھیل گئے۔۔۔۔شوگر بڑھ گئی۔۔۔

پھرایک دن بھائی صاحب ان سارے جھمیلے سے آزاد ہوکرمنوں مٹی کے نیچے جا سوئے۔۔۔۔۔۔۔

آپا پر بجلی ٹوٹ پڑی۔۔۔

پر اب بھی وہ بھائی صاحب کو ہی مورِدالزام ٹہرا رہی تھیں۔۔۔

''خود تو آرام سے چلے گئے۔۔۔مجھ اکیلی کو دنیا کے دکھ جھیلنے چھوڑ گئے۔۔۔

❀❀❀

(۱۴)

واٹس ایپ

لکھا میں نے ''بچے کو'' اور اُس سے مراد میری، میرا بیٹا تھا جسے میں تیراکی کرانے لے جا رہا تھا۔ چونکہ میں نے رومن حروفِ تہجی میں لکھا تھا اس لیے بچہ۔۔۔۔بچی پڑھا گیا۔

عالم صاحب تو خیر اتنے قدامت پسند نہ تھے، مگر اس وقت جب کہ میں عالم صاحب کو واٹس ایپ پر پیغام لکھ رہا تھا، ان کے پاس مولانا اشرفی بیٹھے تھے۔

عالم صاحب بڑبڑائے اتنی سردی میں یہ بچی کو سوئمنگ کرانے کیوں لے جا رہے ہیں۔

''ہائیں۔۔۔۔لاحول ولا۔۔سردی ہو یا گرمی یعنی بچی کو تیراکی کے لیے لے ہی کیوں جا رہے ہیں۔'' مولانا اشرفی نے عالم صاحب کی بڑبڑاہٹ کو اچک لیا۔

''یعنی حد ہوگئی ہے۔ تیراکی جیسے ناپاک اور بے حیائی کی جگہ پر بچی کو لے جانا۔۔۔باپ بیٹی کا یوں اس طرح۔۔۔لاحول ولا۔۔۔'' وہ خود سے بڑبڑانے لگے۔

ابھی یہ قصہ چل ہی رہا تھا کہ سلیم محی الدین وہاں آ گئے۔

''ارے غضب ہو گیا۔۔۔سنا تم نے!'' مولانا اشرفی محی الدین کو دیکھتے ہی بولے۔۔۔''یہ اپنے بارانی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔''

فرانس میں رہتے ہیں تو کیا۔۔۔۔۔ہمارا مذہب دین کا ساتھ ہے نا۔۔۔۔لو بھلا اپنی بچی کو تیراکی کرانے لیے جا رہے ہیں۔

''اچھا!'' محی الدین بھی تعجب سے بولے۔''آپ کو یہ بات کس نے بتائی''۔انہوں نے استفسار کیا۔''ارے انہوں نے خود۔۔۔''اشرفی بولے۔

''ابھی ابھی ان کا واٹس ایپ پیغام عالم صاحب کو آیا ہے اور اس میں انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ وہ اپنی بچی کو تیراکی کرانے لے جا رہے ہیں۔''

''ان کے بچے تو یقیناً بڑے ہونگے'' اشرفی صاحب نے قیافہ شناسی بھی کی۔

''اچھا لائیے میں بھی دیکھوں'' محی الدین نے عالم کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے موبائل فون کو ہاتھ میں لے لیا۔

اور اسے دیکھتے رہے۔واٹس ایپ پیغام پڑھتے رہے، پھر اسے اشرفی صاحب کو لوٹا دیا چونکہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے لینے کے لیے تڑپ رہے تھے۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے''دراصل جہاں تک میری معلومات ہے بارانی کے تو فقط دو بیٹے ہیں۔۔۔بیٹی تو

ان کی کوئی نہیں ہے۔''

''تو اب آ گئی ہو گی ایک بیٹی''اشرفی پیچھے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھے۔

''لیکن ہوسکتا ہے بیٹی سے مراد ان کی بھتیجی ہو'' محی الدین بولے

''اچھا!'' عالم نے کہا

''چلو پھر میں پوچھتا ہوں'' عالم نے بارانی کو واٹس ایپ پر بارانی کو پیغام دیا۔

''بھئی کیا تم اپنے 'سن' کے ساتھ سوئمنگ کرنے جارہے ہو یا اپنی 'ڈاٹر' کے ساتھ۔

اور لگے تینوں انتظار کرنے۔مگر واٹس ایپ پر فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔

شاید بارانی اپنے سن یا ڈاٹر کے ساتھ۔۔۔سوئمنگ کرنے جا چکے تھے۔یوں بھی انہیں کب پرواہ تھی۔

(۱۵)

جنسی ہوس

یورپ آنے کے بعد میرا من سچ مچ ڈولنے لگا تھا۔اس قدر عورتیں اور یوں سر عام میں نے زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھیں۔

میں زمین دوز ٹرین میں بیٹھا تھا اور وہ میرے سامنے والی سیٹ پر تقریباً دراز کسی کتاب میں گم تھی۔یوں میں اس کے علم میں لائے بغیر اس کا بھرپور جائزہ لے سکتا تھا۔میں نے اس کے سراپے پر نگاہ دوڑائی۔خوبصورت چہرے سے پھسل کر میری نگاہ اس کی مخروطی گردن اور اس کے سینے کے ابھار پر رکی اور پھر اس کے سارے جسم کا طواف کرنے لگی۔وہ خاصے ڈیل ڈول والی، بھاری تن و توش کی بائیس پچیس سالہ خوبرو تھی۔اس کا کسرتی جسم اور آڑے تر چھے کولہے میری توجہ کا مرکز بن گئے۔اس نے خوب تنگ سی جینز اور مختصر سا بلاوز پہن رکھا تھا۔اس کا لباس اس کے انگ انگ کی چغلیاں کر رہا تھا اور جسم کا بے لباس حصہ میری نگاہیں خیرہ کیے جا رہا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا اور مجھے یہ بھی نہیں پتہ چلا کہ اس پر میرا یوں گھورنا کُھل چکا تھا اور اسے شاید بہت کُھل رہا تھا۔ جس کا اظہار جب وہ پہلو بدل بدل کر، کرتی تو مجھے اس کے جسم کے اور کئی زاویے مسحور کرنے لگتے۔

میں نے یورپ آنے سے قبل سن رکھا تھا کہ یہاں بہت بے حیائی ہے اور لڑکیاں اور عورتیں بہت بے شرم ہوتی ہیں۔ اور تو اور سرراہ چلتی لڑکیاں کسی کے ساتھ بھی کہیں بھی چلنے کو تیار ہو جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں آنے کے بعد جب میں نے اپنے دوست سے اپنی حیرانی کا اظہار کیا کہ سب کیسے تنگ اور جسم کی نمود و نمائش کرتے لباس زیب تن کرتی ہیں تو اس نے مجھے بتایا کہ نیم عریاں دراصل عریاں ہونے سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ اور اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے کبھی تیرا کی کرانے لے چلے گا جہاں میں اپنی نگاہوں کی اس سے بھی زیادہ ہوس پوری کرسکوں گا۔ اور اس نے مزید بتایا کہ وہ مجھے ایسے حمام لے چلے گا جسے کپڑوں سے مبرا نہانا کہتے ہیں۔

تو پھر کیا وہاں صرف مرد آتے ہیں، میرے اس معصومانہ پُر تجسس سوال پر میرے دوست نے بہت زور سے قہقہہ لگا کر مجھے بتایا تھا کہ نہیں وہاں عورتیں اور مرد دونوں ننگے ہوتے ہیں وہاں لباس پہننے کی ممانعت ہوتی ہے۔ یہ سن کر اور اِسوقت اِس خوبصورت انتہائی جاذب نظر اور میری نگاہوں کی ہوس چڑھی لڑکی کو دیکھ کر میرے اوسان کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔ کچھ اور بھی خطا ہونے لگا تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر مبہوت اس کے جسم سے اپنی نگاہیں سینک رہا تھا۔ تصور میں اسے بے لباس دیکھ رہا تھا۔ اس کو چھونے کے لیے ایسے ہولے ہولے انگلی آگے بڑھا رہا تھا جیسے کوئی بچہ پہلی مرتبہ کسی موم بتی کے شعلے کے قریب انگلی لے کر جا رہا ہو۔

کب سارے مسافر آہستہ آہستہ ڈبے سے اتر کر چلے گئے مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔ کب ٹرین

اپنی منزل کے آخری اسٹیشن پر رکی مجھے نہیں پتہ چلا۔ میں اپنے جسم کے حصے کے تناؤ سے لطف اندوز ہور ہاتھااور ٹکٹکی باندھے اس نوخیز دوشیزہ کے جسم کی میٹھی میٹھی آگ میں جل رہا تھا۔۔۔۔۔

میں نے دیکھا کہ وہ سیٹ پر سے اٹھی۔۔وہ میرے قریب آئی۔۔مجھ پر جھک کر۔۔۔۔۔اس نے مجھ سے کسی نامانوس زبان میں کچھ کہااوراس سے قبل کہ میں جنبش بھی کرتااس کا ہاتھ میرے گال پراس زور سے پڑا کہ مجھے دن میں تارے نظر آنے والے محاورے کی عملاً تفسیر کا پتہ چل گیا۔ میں تلملا کراٹھاتو اسوقت ٹرین رک چکی تھی۔ٹرین کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو خاتون پولیس آفیسر ڈبے میں داخل ہوکر میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے جسموں کا جائزہ لینا بالکل بھول چکا تھا۔

(۱۶)

آسام کی شہریت

"**آپ** کے تمام کاغذات درست ہیں۔اور ہمیں آپ کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی کوئی شکوک وشبہات بھی نہیں ہیں۔مگر ہمارے شہریت کے قانون کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہر وہ شخص جو ہماری شہریت لینے کا خواہاں ہواس کے لیےاپنی پیدائش کا سرٹیفیکیٹ پیش کرنا ضروری ہے۔۔۔۔"

شہریت کی تبدیلی کے محکمے میں وہ اس خاتون آفیسر کے سامنے بیٹھا تھااور وہ بلاتوقف اپنی بات کیے جارہی تھی۔

اسے پریشانی یہ تھی کہ اس کے پاس پیدائش کا سرٹیفیکیٹ کے علاوہ تمام کاغذات موجود تھے۔اس کے خاندان کو دو مرتبہ فسادات کی صعوبتیں جھیلنا پڑی تھیں۔اور جب وہ اور اس کا خاندان جان بچا کر بھاگا تو ایسے میں پیدائش کا سرٹیفیکیٹ کہاں سے ساتھ لیا جا سکتا تھا۔۔۔۔البتہ اس کے پاس آٹھویں جماعت سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک کے تمام اسناد موجود تھے۔

"دیکھیں آپ کو یقین تو ہے نا کہ میں پیدا ہوا تھا۔۔۔۔نہ ہوتا تو آپ کے سامنے کیونکر بیٹھا ہوا ہوتا۔"اس نے جواب دیتے وقت اپنے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

" مگر اتنا کافی نہیں ہمیں مقام اور تاریخ و سن کے حقیقی ہونے کی سند بھی چاہیے۔"

آفیسر بولتی رہی۔

وہ خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ اب وہ اس آفیسر کو کیسے قائل کرے۔۔۔۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آفیسر پھر بولی۔۔۔۔

" آپ کی والدہ حیات ہیں۔۔؟"

"جی ماشاءاللہ"اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

اس کا جواب سنکر آفیسر بولی۔۔۔" آپ ایک کام کریں کہ اپنی امی کا ایک حلف نامہ داخل کرادیں۔جس سے آپ کی تاریخ پیدائش جو کہ تمام اسناد میں موجود ہے اس کی تصدیق ہو جائے۔" آفیسر خاموش ہوگئی۔۔۔

"مم مطلب۔۔۔۔صرف میری امی کا حلف نامہ کافی ہوگا۔۔۔؟"وہ بےیقینی سے بولا۔

"یہ صرف نہیں ہے۔یہ بہت کافی ہے۔آپ کی امی سے زیادہ اور کون معتبر ہوسکتا ہے۔ہمارے محکمہ اس سے پوری طرح مطمئن ہوگا۔۔۔۔۔"

وہ خوشی خوشی اٹھ گیا۔۔۔۔

اس نے باہر نکل کر اپنی ماں کو آسام فون کیا اور اپنی ماں کو بتانے لگا کہ اسے اس کی شہریت تبدیل کروانے کے لیے اس کی ماں کا حلف نامہ چاہیے۔۔۔۔۔

اس کی ماں نے فون پر ہنستے ہوئے کہا۔۔۔" مگر بیٹا میری تو خود کی شہریت کو آسام کی حکومت ماننے سے انکار کر رہی ہے تو کیا ایسے میں یورپ میں میرا حلفیہ بیان تسلیم کر لیا جائے گا؟"

"امی وہ آپ کے بیان کو سب سے معتبر سمجھتے ہیں۔ یورپ میں ماں کا تقدس اب بھی باقی ہے۔ یہ انسانی حقوق کا معاملہ ہے"۔۔۔۔وہ ماں بیٹا بات کرتے رہے۔۔۔

فون رکھتے ہوئے اس کی ماں نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''مگر بیٹا میرے پاس تو اَدھار کارڈ نہیں ہے میں کیسے حلفیہ بیان بنوا سکتی ہوں''۔

(۱۷)

محبوبہ

اس نے اپنا گھونگھٹ اتنا نیچا کیا ہوا تھا کہ مجھے اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ مستقل روتی جاتی، سسکاری لیتی اور بولے چلی جارہی تھی۔

''بس مجھے نکاح میں لے لو۔۔۔تم نے تو میری زندگی خراب کر دی ہے۔''

''ارے بھئی میں شادی شدہ بچوں والا ہوں۔۔۔بھلاتم سے کیسے نکاح کرسکتا ہوں؟''میں نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں! ہمارے مذہب میں ایک سے زیادہ نکاح جائز ہے۔''وہ پھر بولی ''اورتم نے مجھ سے پیار کیوں کیا تھا۔''

''دیکھو ہماری تو بس یونہی دوستی تھی۔کبھی کبھار وقت گزاری کیلئے میں تم سے بات چیت کرلیا کر تا تھا۔ کیا میں نے تم سے شادی کا وعدہ کیا تھا؟''میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''نہیں زبان سے تو تم نے کبھی بھی ایسا کچھ نہیں کہا۔مگر تمہارے انداز سے پتہ چلتا تھا۔تم جس دل لگی سے مجھے لکھتے۔۔۔میری نوک و پلک سنوارتے۔۔مجھے قرطاس پر سجاتے۔۔مجھے گمان ہوا کہ اب تم مجھے پوری شدت سے چاہتے ہو''۔

''ہاں! ''میں نے کھوئی ہوئی دور سے آتی آواز میں کہنا شروع کیا۔''چاہتا تو میں شاید کبھی یہی تھا کہ تجھے چاہوں۔۔۔تجھ میں خود کو سمودوں۔۔۔اور پھر خیالات کے ایسے دُر تیرے گہرے سمندر سے نکال کر لاؤں کہ میرا قاری دنگ رہ جائے۔۔۔خواہش میری بھی تھی کہ میں ایک ایسا افسانہ نگار بن سکوں جسے لوگ صدیوں یاد رکھیں''۔

میں جانے کیا کیا بولتا گیا اور وہ خاموش سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔

''تو۔۔۔تو۔۔پھر۔۔۔'' میرے خاموش ہونے پر وہ بولی'' آؤ۔۔۔میرا گھونگھٹ اٹھاؤ ۔۔۔میرا مکھڑا دیکھو۔۔۔میں اب بھی تمہاری ہوں۔۔۔بس تم مجھے اپنالو۔۔وہ میرے قریب کھسکنے لگی۔۔

''نا۔۔نا۔۔میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔۔

’’بھئی مجھے زندگی کے اور بہت کام ہیں۔مجھے دفتر جانے میں دیر ہو جائے گی۔۔۔ابھی مجھے اپنے بیٹے کو تیار کر کے ساتھ لے جانا اور اسے اسکول چھوڑنا ہے۔۔واپسی پر اسے لیکر آج شام کھیلنے جانا۔۔۔

۔۔۔بس اب تم جاؤ۔۔۔جاؤ میری کہانی۔۔اب جاؤ۔۔کہہ کر میں نے قلم بند کر کے رکھ دیا۔۔۔۔۔۔

(۱۸)

سپاری

سر آپ تو کراچی کیا پورا پاکستان ہی کنٹرول کرتے ہیں۔بس آپ چاہیں تو۔۔۔۔۔نو وارد شخص گھگھیاتے ہوئے مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔اس بھاری تن و توش کے شخص نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔۔۔۔۔۔اور دھیمے لہجے میں پیچھے کھڑے شخص سے بولا ان سے بریف کیس لیکر گن لو اور رقم کے مطابق سپاریاں دے دو۔

باڈی گارڈ آگے آیا اور دوسرے شخص کے سامنے مجسم سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔اس نے اپنا وزنی بریف کیس باڈی گارڈ کی طرف بڑھا دیا۔

باڈی گارڈ بریف کیس لے کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔اور پھر کچھ دیر بعد نمودار ہوا اور

سیدھے اپنے باس کے پاس جا کر اس کی مٹھی میں کچھ رکھ دیا۔

باس نے مٹھی کھولی اور اس کی ہتھیلی پر تین موٹی سی گول سپاریوں کی سالم ڈلی رکھی تھی۔

''تین کی رقم ادا کی ہے نا آپ نے''؟

اس نے سامنے بیٹھے شخص سے سوال کیا۔

''جی جی حضور۔۔۔۔''اس نے جواب دیا۔

''تو بس ٹھیک ہے آپ یہ تین سپاری کی ڈلیاں ایک کاغذ میں لپیٹ کر کراچی میں ہمارے آدمی کو دے دیں اور اس کاغذ پر تینوں افراد کے نام لکھنا مت بھولیے گا۔''

''اب آپ جا سکتے ہیں۔''

وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور باڈی گارڈ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور اسے باہر چھوڑنے چلا گیا۔

''تو جناب وکیل صاحب آپ کیا کہتے ہیں۔میٹنگ میں بیٹھے امیگریشن افسر نے وکیل سے دریافت کیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا جیسے وہ ان کی تائید چاہتا ہو۔دونوں ساتھیوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''جی دیکھیئے وکیل نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔میرے موکل کا کیس اتنا مضبوط ہے کہ وہ یورپ کے کسی بھی ملک میں جا کر اپنا سیاسی پناہ کا کیس منظور کروا کر وہاں کی شہریت اختیار کر سکتا ہے۔اب یہ آپ لوگوں کے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ برطانیہ میں رکے یا کہیں اور چلا جائے۔''

''میرا موکل اس بات پر تیار ہے اور وہ اس بات کی ضمانت دے گا کہ اس کا دائرہ کار برطانیہ اور یورپ کی حدود سے باہر ہوگا۔پھر آپ کو اس بات سے کیا غرض ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔'' وکیل نے اپنی بات مکمل کی۔

(۱۹)

نہیں نا۔۔۔۔

ہر عورت جونظر آتی ہے وہ، وہ ہوتی نہیں ہے۔روسی لکڑی کی گڑیا کی طرح، اوپری پرت کھول کر دیکھو تو اندر پھر سے ایک ثابت گڑیا نکلتی ہے۔اور یوں آپ اس کی پرت اتارتے چلے جائیں اندر سے ایک دوسری گڑیا ہی برآمد ہوگی۔تہہ در تہہ جیسے صدف، سیپ میں، سیپ گہرے پانی میں۔

رات کے اندھیرے میں جولیا اور رابرٹ بستر میں گھسے ایک دوسرے میں مدغم تھے۔جولیا رابرٹ پر مہربان تھی۔وہ بارش کی مانند برس رہی تھی۔اس کے ذہن کی پرتیں کھلی جارہی تھیں اور رابرٹ ہر کھلتی پرت سے پھوٹنے والی بوند سے اپنے ہونٹ، اپنی آنکھ اور انگلیوں کے لمس گیلے کر رہا تھا۔رابرٹ اور۔۔اور کی ہوس میں آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔قریب تھا کہ کنویں تک پہنچ کر اپنی تشنگی کو بھرپور طریقے سے سیراب کرتا۔۔۔۔اپنی پیاس بجھالیتا۔۔۔جولیا نے خود کو سمیٹا۔۔۔اور بولی ''نہیں''۔

رابرٹ بوکھلا گیا۔۔۔۔وہ تو مدحوش ہو رہا تھا۔اسے اس کی پیاس بجھتی محسوس ہو رہی تھی کہ اچانک جولیا خود کو سمیٹنے لگی، اس کے لبوں سے ہلکی آواز میں نکلنے والے لفظ۔۔۔۔''نہیں''۔۔سن کر اس کا دماغ گھوم گیا۔۔۔۔مگر وہ اور پوری قوت سے کنویں کی منڈیر سے ڈول کنویں کے اندر گرانے کی سعی کرنے لگا۔جولیا نے اسے دھکا دیا اور وہ پیچھے ہٹنے لگی۔رابرٹ پر جنون طاری ہونے لگا۔اس نے مزید کوشش کی جولیا کو اپنے بانہوں میں

جکڑنے کی۔اور وہ تڑپ کر مچلنے لگی۔رابرٹ غصے میں آ گیا۔اور طیش میں آ کر اس نے جولیا کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔جولیا نے ہلکی آواز میں سسکی لی اور ایک کے بعد ایک اپنی کھلتی پرت کو بند کرنے لگی۔اس کا ذہن،اس کی آنکھیں،لب،جسم اور جسم کے حصے سب سکڑ کر بند ہونے لگے۔۔۔۔۔رابرٹ کو لگا کہ جیسے وہ فقط ایک سراب کے قریب پہنچ کر رک گیا ہو۔رابرٹ نے ایک اور ناکام کوشش کی اور جولیا نے اسے دھکا دیا اور خود پرے ہوگئی۔اب جو رابرٹ اس کی طرف بڑھا تو وہ تیزی سے بستر سے اٹھ کر اترنے لگی۔اس نے اپنے کپڑے سنبھالے اور برق رفتاری سے غسل خانے کی طرف نکلنے لگی۔وہ بے دھیانی میں دروازے سے ٹکرائی مگر فوراً ہی سنبھلتی خواب گاہ سے منسلک غسل خانے میں گھس کر تیزی سے اس کا دروازہ مقفل کرلیا۔

رابرٹ اس کے پیچھے اٹھا۔۔۔مگر پھر اس نے خود کو بستر پر گرالیا۔

جولیا قریب گھنٹے بھر غسلخانے میں بند رہی۔اپنے جسم پر ٹھنڈا پانی بہاتی رہی۔اور رابرٹ بستر پر لیٹا انگاروں پر خود کو جھلستا محسوس کرتا رہا اور اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔اس نے گھڑی دیکھی دس بج رہے تھے۔ابھی وہ گزرے واقعہ کی کڑی ہی جوڑ رہا تھا کہ اسے جولیا کی مترنم آواز آئی۔۔۔۔۔

''آجاؤ ناشتہ تیار ہے۔'' اس کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔مگر وہ بادل نخواستہ اٹھا اور غسلخانے میں گھس گیا۔

چند منٹوں بعد وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا۔۔۔اُس کی بیوی اس کی پیالی میں ایک ہاتھ سے چائے انڈیلتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے رابرٹ کے ماتھے پر پڑے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔رابرٹ نے سر اٹھا کر جولیا کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔۔۔اور

پھر پوچھنے لگا۔''یہ سب کیا ہے''؟
جولیا نے اتراتے ہوئے کہا۔۔۔''عورت جب 'نا' کہے۔۔۔تو اس کا مطلب 'نا' ہوتا ہے۔تم پھر کوشش کر لینا۔۔۔''

(۲۰)

پالش والا صاحب

''**پالش** کرالو صاحب.....'' اور وہ آواز سن کر رک گیا۔اُس نے جیب سے اٹھنی نکال کر نوجوان کے ہاتھ پر رکھنا چاہی تو نوجوان تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔
''نا صاحب! اسے اپنے ہی پاس رکھو۔میں فٹ پاتھ پر اپنی عزتِ نفس کا سودا کرنے نہیں آ بیٹھا۔اپنی محنت کا عوضانہ لینے آتا ہوں۔پالش کروانی ہے تو کرواؤ ورنہ اپنا راستہ لو۔''
وہ حیران رہ گیا۔شہر کا وہ متمول شخص جس کے سامنے بڑے بڑے سرکاری افسران جوتیاں گھستے تھے۔ہاں لیکن یہ عزتِ نفس والا ہے! اُس نے دل میں سوچا۔اور پیر بکس پر رکھ دیا۔
نوجوان نے جلدی جلدی مختلف ڈبیاں کھولی اور پالش کرنے لگا۔الٹے پیر کے جوتے کو خوب چمکانے کے بعد وہ بولا۔
''دیکھ لو صاحب کس قدر چمک اٹھا ہے جوتا۔امیروں کے جوتے کی چمکدار نوک میں غریبوں کا چہرہ تو نظر آجاتا ہے۔لیکن ان کے سیاہ دل میں خود ان کا اپنا عکس تک نہیں ملتا۔'' وہ خاموش رہا

اور پیسے ادا کر کے چلدیا۔

دوسرے دن سیٹھ نے اُسی پالش کرنیوالے نوجوان کو اپنے دفتر بلوایا۔

''کیا تعلیم ہے''؟۔اُس نے نوجوان سے پوچھا۔

''اس سال گریجویٹ ہوجاؤنگا''۔نوجوان نے جواب دیا۔''ویل۔''سیٹھ بولا۔''مجھے یہی توقع تھی۔''

''دیکھو۔''سیٹھ نے بات آگے بڑھائی۔''آج سے تم ہماری فیکٹری کے.... پروڈکشن مینجر ہو۔

جاؤ ہمارا آدمی تمہیں فیکٹری دکھادے گا۔''

چند ماہ بعد وہی نوجوان دوبارہ سیٹھ کے کمرے میں آتا ہے۔

ہیلو کہہ کر سیٹھ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔''نہیں۔''نوجوان نے سختی سے کہا ۔''میں استعفیٰ لیکر آیا ہوں۔''اس نے جب سے ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

''سنو۔''نوجوان پھر بولا۔''مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تمہاری فیکٹری میں جعلی اور نشہ آور ادویات بنتی ہیں۔میں اب ایک لمحہ بھی تمہارے یہاں کام نہیں کرسکتا۔''

''ہوں!۔''سیٹھ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''تم اتنے عرصے بعد بھی وہی بوٹ پالش کرنے والے ہی رہے میں نے چاہا تھا کہ کسی کے چمکدار جوتے میں تمہارا عکس بننے کے بجائے خود تمہارے جوتے میں چمک آجائے۔''سیٹھ بولتا رہا۔''لیکن افسوس!۔''

''میرے جوتے پر چمک دلانے کا شکریہ۔'' نوجوان نے جذبات سے پُر لہجے میں کہنا شروع کیا ''ایسی سیاہی پر جو میرے جوتے کو چمکیلا اور میرے دل کو سیاہ کردے، میں لعنت بھیجتا ہوں۔اتنا کہہ کر نوجوان مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

’’نان سینس ۔‘‘سیٹھ نے بڑبڑاتے ہوئے کاغذ پھاڑ کر ہوا میں اچھال دیا۔‘‘

❁❁❁

(۲۱)

سورج کا اغوا

سیاسی گھٹن ایسی تھی کہ سیاسی شعور رکھنے والے ملک کو پیٹھ دکھا چکے تھے۔ چونکہ تیسری نسل قربانی کا بکرا بننے کو تیار نہ تھی۔ سیاست کے کھیل میں اپنی پیٹھ اور گردن وہ کیوں پیش کرتے۔ سیاسی کارکن تشدد کے خوف سے دور ہوگئے۔ معاشی بدحالی بندر بانٹ اور لوٹ مار کی فضا میں غربت پھیل رہی تھی اور معاشی دیوالیہ کے خوف نے بھی بہتوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔مگر یہی مہاجر اپنے اہل خانہ، رشتہ داروں اور دیگر افراد کی کفالت کے بہانے ملک کو سرمایہ بہم پہنچانے کا سبب بن گئے۔ دہشت کے بوئے ہوئے بیج کی کونپلیں پھوٹیں تو دہشت گردی نے جنم لیا۔۔۔اب وہ جوتوں کی دھمک سے بھی کوئی خوف نہ کھاتے تھے۔ جو کبھی بوٹوں میں روند دیئے جاتے تھے اب سر اٹھائے تناور درخت بن چکے تھے۔اور بوٹوں کو تائب کرنے کا سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔اب سیاسی گھٹن آگے بڑھ کر سیاسی دہشت گردی بن چکی تھی۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ملک کے سیاہ وسفید پر قبضہ اور تیرگی کو عام کرنے کا سوچ رہی تھی۔ سیاست داں کرپشن اور دولت بنانے پر اکتفا کر رہے تھے۔مگر یہ نئی قوت،عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیکر تمام دولت کا اکیلا وارث بننے کے چکر میں تھی۔۔ بوٹ بردار تو جنگی حالت میں تھا۔ وہ جیتے گا تو فاتح اور لوٹ مار۔ ہارے گا تو فاتح کی وفاداری قبول کرلے گا۔۔۔۔۔مگر عوام کا کیا بنے

گا۔۔۔۔کرپشن کو جائز جاننے والا سیاسی وفاداری تبدیل کیا کرتا تھا مگر بوٹ بردار تو ہتھیار پھینک کر وفاداری اور وابستگی بدل لے گا اور فاتح کی دفاع میں ہتھیار اٹھالے گا۔۔۔۔کیا پڑوسی ملک میں یہی نہیں ہوا۔۔۔۔کیا واقعی ایسا نہیں ہوگا۔۔۔۔سوچ سوچ کر وہ پاگل ہورہا تھا۔وہ تو رات بہت کالی ہے اور گہنے سورج کو رورہا تھا۔۔۔کہ اچانک ایک دن سورج ہی اغوا کرلیا گیا۔۔۔

آج صبح سے سورج کے طلوع ہونے پر پابندی لگادی گئی ہے۔اندھیرے میں ایک شخص چیخ چیخ کر شور مچارہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا کہ صرف خاص مذہبی جنونی رسم جسے وہ۔۔۔۔۔۔کا نام دے رہا تھا،صرف وہی ادا کرنے کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔نوجوان بیواؤں کے گھروں پر محافظ تعینات کردیئے گئے تھے۔لڑکیوں کے اسکول اصطبل میں تبدیل کردیئے گئے۔جہاں اعلی نسل کے گھوڑوں کی افزائش ہوا کرے گی۔

اچانک اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔۔۔پہلے ہلکی ہلکی پھر دروازہ زیادہ زور سے پیٹا جانے لگا۔۔۔۔

شور کی آواز میں وہ جاگا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے تھے۔وہ آنکھیں مل مل کر خود کو یقین دلانے لگا کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔

۔۔۔۔۔۔ابھی وہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ اس کے کانوں میں بیوی کی آواز آئی اٹھ جائیں ناشتہ لگ گیا ہے دفتر کو دیر ہوجائے گی۔

(۲۲)

تنہا چھت

گھر کی چھت کتنی تنہا ہے اس کا کسی کو کبھی احساس نہ ہوا۔ دیکھنے میں بظاہر ایسا ہی لگتا کہ چھت تو دیواروں کے سہارے ٹکی ہے۔ لیکن حقیقتاً چھت ہی دیواروں کو جوڑے مکان کو مکمل بنائے رکھتی ہے۔ اسی چھت نے اس مکان کے بننے، مکینوں کے یہاں آباد ہونے تک نہ جانے کتنے مدوجزر دیکھے، گھر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیوار پکڑ پکڑ کر چلنا سیکھتے دیکھا جو پھر ایک دم سے قدآور ہو گئے۔

چھت کسی سائے کی طرح مکینوں کے سر پر کھڑی رہی۔ دھوپ کی تپش، تیز ہواؤں کے جھکڑ اور طوفانی بارشیں سب ہی کچھ خاموش اور تنہا جھیلتی رہی۔ اندر کبھی کسی کو گھر کے باہر کے موسم کا پتہ ہی نہ چلنے دیا۔

چھت کو وہ دن بھی یاد تھے جب یہ چھت مکان کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کر رہی تھی۔ سبھوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی کہ کب چھت کی ڈھلائی کا کام مکمل ہو تو مکان تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر سکے۔

اماں جب پہلی بار تعمیر کے دوران گھر دیکھنے آئیں تو بولیں ''اے لو یہ کیسا مکان بھئی۔۔۔۔جب تک چھت نہ پڑ جائے خالی دیواریں ہی ہوتیں ہیں۔''

''اماں۔۔۔بھائی صاحب بولے۔۔۔آپ بھی نا۔۔۔ارے بھئی آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ہم یہاں فوری طور پر منتقل ہو رہے ہیں۔۔۔ابھی تو چھت پڑنے کے بعد بھی بہت کام باقی بچے گا۔ہاں چھت پڑنے میں۔۔۔جمنے میں وقت تو لگتا ہے۔۔۔

ہاں یہ تو ہے۔۔اماں بھائی صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔۔۔۔

گھر بن گیا تھا۔۔۔سب رہنے لگے تھے۔۔۔۔

وقت کسی برف کی بڑی سی سِل کی طرح آہستہ آہستہ پگھلتا رہا۔۔۔

گھر کے مکینوں کا خیال تھا کہ اب گھر میں رنگ وروغن کی ضرورت ہے۔

رنگریز آیا۔۔۔سارے کمرے۔۔۔دیواریں۔۔۔۔چھتیں دیکھتا رہا۔۔۔اور پھر بولا۔۔۔

دیواریں اور دروازے کھڑکی۔۔۔رنگوالو۔۔۔میں جلدی کردونگا۔۔۔

اور۔۔۔یہ چھت تو کافی صاف دکھتی ہے۔۔۔اس کو رنگنے کی ابھی ضرورت نہیں۔۔اسے ابھی رہنے دیتے ہیں۔۔۔

گھر کے سارے مکین متفق تھے۔۔۔ہر کوئی اپنے اپنے کمرے کی دیواروں کے لئے ایک علیحدہ رنگ چن رہا تھا۔۔۔

۔۔۔۔۔صرف چھت کا کسی کو خیال ہی نہ تھا۔۔۔جو اداس نظروں سے سارے منظر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

(۲۳)

خصوصی ضیا(ء)۔۔۔۔(آ) فت

طلباء کو آج ایک خصوصی پروگرام کے تحت، رات کے کھانے کے بعد دودھ میں بھنگ ملا کر پلائی گئی۔۔۔۔۔۔

جب وہ نشے سے دھت ہو گئے تو انہیں ایک قطار میں ہاسٹل کے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک بڑی سی اسکرین پر فلم دکھانے کا بندوبست تھا۔۔۔۔ یہ ایک طرح کا سنیما ہال تھا۔ لڑھکتے، گرتے پڑتے جب طلباء ہال میں پہنچے تو انہیں ایک ایک کر کے سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔۔۔۔۔ ہر ایک طالب علم کے برابر میں ایک سیٹ خالی رہی۔۔۔۔ روشنی گل کر دی گئی اور فلم چلنا شروع ہوئی۔۔۔

فلم میں ایک خوبصورت نوجوان پردے پر آتا ہے۔۔۔۔۔ اپنی خودکش حملے کی جیکٹ کو چند لمحوں میں اڑا کر لہولہان ہو جاتا ہے۔۔۔

کئی ایک ایسے ہی مناظر پیش ہوئے۔۔۔۔ کئی نوجوان اپنے ہی خون میں نہا گئے۔۔۔۔ ساتھ میں اپنے دشمنوں کو بھی موت کی وادی میں لے آئے۔۔۔۔

موت کی وادی میں ان کی پذیرائی خوبصورت نوجوان دوشیزائیں کرتی نظر آرہی تھیں ۔۔۔
پردے اسکرین پر چلتے مناظر ۔۔۔۔۔اوران کا شور ۔۔۔طلباء کونیم خوابیدہ حال میں جگائے رکھنے کا باعث تھا ۔۔۔مگران کے حواس پوری طرح ان کے قابو میں نہ تھے ۔۔۔۔۔
اچانک سے منظر بدلا ۔۔۔۔۔ساتھ ساتھ ۔۔۔۔پوراہال مصنوعی طور پر تیار کردہ دھویں سے بھر گیا ۔۔۔اس کے لئے ایک مخصوص مکینیزم پردے کے پیچھے سے کام کررہا تھا ۔۔۔
منظر دکھارہا تھا ۔۔۔کہ ۔۔۔وہی نوجوان جوتھوڑی دیر قبل ۔۔۔خون میں لت پت تھے ۔۔۔جنکے چیتھڑے اڑ چکے تھے ۔۔۔ایکبار پھر سے تروتازہ ۔۔۔۔خوبصورت لباس میں چل پھر رہے تھے ۔۔۔۔ہواؤں میں اڑ رہے تھے ۔۔۔۔۔
ہال کا دروازہ ۔۔آہستہ ۔۔آہستہ کھلنے لگا ۔۔۔۔
ایک قطار میں ۔۔۔نوجوان خوبصورت ۔۔۔۔
نیم برہنہ لڑکیاں ۔۔۔۔سرعت کے ساتھ ہال میں داخل ہوگئیں ۔۔
اور ۔۔۔۔
ہرطلباء کے برابر میں خالی سیٹ پر براجمان ہوگئیں ۔۔۔۔
نیم غنودگی حالت میں ۔۔۔
برابر میں بیٹھے ہر طالب علم کا ہاتھ ۔۔۔
برابر کی سیٹ کی جانب رینگنے لگا ۔۔۔

(۲۴)

قابلِ اعتراض

''آپ کیوں رو رہی ہیں۔'' پرنسپل صاحب گرجے۔''اور میری بات کا جواب دیں کہ آپ لوگ اُدھر کیا کر رہے تھے۔''
وہ پہلے ہی بے حال ہو رہی تھی۔ گرج سنکر اس کی حالت دِگرگوں ہوگئی۔ اُس نے لہراتے ہوئے میز کا سہارا لینا چاہا اور ناکام رہی۔ میں فوراً ہی جھپٹا اور وہ اب میرے بازوں میں جھول رہی تھی۔ میں نے اُسے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔
اور پلٹ کر سامنے لگے مجمعے کی طرف دیکھنے لگا۔ پرنسپل صاحب نے ایک چپراسی کو پانی لانے کو کہا اور میں پانی کے انتظار میں ہونے والی بھانت بھانت کی گفتگو سننے لگا جو انتہا درجے تک ہماری ذات کی عزت افزائی میں تھی۔
''کیا ہوا۔۔'' ایک آواز۔''ہائے اللہ کیسے بے شرم ہیں یہ لڑکے لڑکیاں پتہ نہیں کیا کر رہے تھے۔ سر نے پکڑا ہے۔'' دوسری آواز۔
''واقعی!'' تیسری آواز۔''کیا ہمارے گروپ کا کوئی ہے۔''
''توبہ کرو۔'' آواز پھر آئی ہمارے گروپ میں ایسا بے غیرت کون ہے۔۔انہی لوگوں نے کالج کا ماحول خراب کیا ہے۔'' چوتھی آواز۔
ایک آواز ابھری۔''کیا یہ لوگ قابلِ......حالت میں....
اس سے آگے میں نہ سن سکا، غصّہ کی شدت سے میں جھٹکے سے اٹھا تو اس چپراسی سے ٹکرایا جو

پانی لیکر آیا تھا۔ میں نے بڑھ کر گلاس اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو ایک استاد نے مجھے پرے دھکیل کر گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ایک دو لڑکیاں اندر آ گئیں تھیں جو بے ہوش پڑی صائمہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔

اچانک ہی فون چیخنے لگا۔ میں دعا کرنے لگا یا اللہ ڈیڈی نے فون کیا ہو۔ پرنسپل صاحب فون سننے لگے۔ کچھ دیر ہوں ہاں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

''یہ..... یہ.... صائمہ ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔ ''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم فرحان...؟'' انہوں نے پھر پوچھا... ''جی جی۔'' میں ہکلایا۔

''ایک ٹیکسی پکڑو۔'' انہوں نے چپراسی کو انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور صوفے پر پڑی صائمہ جو ہوش میں آ چکی تھی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''سوری ڈاٹر..... میں نے ٹیکسی منگوالی ہے اب تم لوگ گھر روانہ ہو جاؤ۔ تم دونوں کے پاپا انتظار کر رہے ہیں........!''

(۲۵)

اقلیتی امور

"**کون ہے** جو یہ گستاخی کر رہا ہے۔؟" دربار میں بادشاہ سلامت کی آواز کی گونج سے در و دیوار تھرانے لگے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ جواب دیتا۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔

بادشاہ نے وزیر باتدبیر کی جانب اچٹتی نگاہ ڈالی تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔۔۔۔ جیسے ہمت نہ جٹا

پار ہا ہو جواب دینے کے لیے۔۔۔۔

جب بادشاہ نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا!

" آخر کون؟"

تو پھر وزیر نے ممناتے ہوئے کہا:

"حضور والا جان کی امان پاوں تو عرض کروں کہ یہ وہی پاگل، اجڈ ہے جو پہلے بھی دربار عام میں حاضر ہو کر گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ جسے آپ نے معاف فرما دیا تھا۔

اب پھر دربان کے سر ہو رہا ہے جس نے اسے روک رکھا ہے۔"

"اچھا۔۔۔!"

"تو جاؤ اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ اسے ملک کی اقلیتی امور کا وزیر مقرر کیا جاتا ہے۔

اسے شاہی پوشاک پہنا کر کل دربار میں حاضر کیا جائے۔۔۔۔"

"مم۔۔۔مگر حضور کا اقبال بلند ہو۔۔۔وزیر نے منہ کھولا

حضور وہ تو اقلیتی طبقے کا کٹر دشمن۔۔۔۔"

"خاموش!"

"بادشاہ کی دھاڑ میں وزیر کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

" کیا تمہیں اب میرے فیصلوں کی صحت پر شک ہونے لگا ہے۔"

" کیا تم نہیں جانتے کہ میرے فیصلے کا دائرہ کار تم سب کی سوچ کے محور سے پرے ہے"؟

اس کے پاگل پن سے ساری اقلیت بھی سیدھی رہے گی اور اکثریت کی مانگ بھی پوری ہو جائے گی۔

جاؤ جا کر میرے حکم پر عمل کرو۔۔۔۔۔"

کہہ کر بادشاہ سلامت نے ہاتھ کے اشارے سے دربار برخاست کردیا۔

(۲۶)

بچے کی شکایت

میں صبح چھ بجے اٹھادیا جاتا ہوں اور آٹھ بجے میرا اسکول شروع ہوجاتا ہے۔ ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا پکڑے اور دودھ کا گلاس خالی کئے بغیر میں اسکول جانے کے لئے گاڑی میں جابیٹھتا ہوں۔ بارہ بجے کے قریب جب میرا اسکول ختم ہورہا ہوتا ہے تو میری استانی مجھ سے کہتی ہے کہ تمہیں ایک بجے تک اسکول میں ہی رہنا ہوگا کیونکہ تم جن مضامین میں کمزور ہو ان میں تمہاری مدد کی جائیگی۔ حالانکہ میں کمزور کسی بھی مضمون نہیں ہوں۔ وہ تو بس سوال جواب کے وقت میرا ذہن کسی کھیل یا شرارت کی طرف چلا جاتا ہے اور استانی سمجھتی ہے کہ مجھے جواب نہیں آتا۔ اسکول میں دیر تک ٹھہرنے کی وجہ سے بورڈنگ میں کھانے کا بیشتر حصہ نکل چکا ہوتا ہے۔ میرے دوست جن کے ساتھ میں عموماً کھانا کھاتا ہوں۔۔۔۔۔۔شرارتوں کے ساتھ وہ کھانے سے فارغ ہوچکے ہوتے ہیں۔۔۔اور مجھے کھانے میں مزانہیں آتا۔۔جیسے تیسے کھا کر میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہوجاتا ہوں۔کھیل کے دوران میں کئی بار باہر جانے کے گیٹ کی طرف آتا ہوں کہ شاید مجھے لینے۔۔۔میرے پاپا۔۔۔مگر نہیں وہ تو آئیں بھی تو مجھے نہیں لے جاسکتے۔ میرے ممی پاپا علیحدہ رہتے ہیں اور میرے پاپا کو اس کی اجازت

نہیں کہ وہ جب چاہیں مجھے لے جاسکیں۔ممی کا خیال ہے کہ اس طرح میری غلط تربیت ہوگی۔ کیونکہ پاپا سے اچھی تربیت میری دیکھ بھال کرنے والے لوگ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔اور ممی وہ تو مجھے کبھی پانچ اور کبھی چھ بجے ہی لینے آئے گی۔

ہاں ہفتے میں وہ، دودن مجھے جلدی لینے آجاتی ہے مگر وہ مجھے لیکر گھر نہیں جاتی۔۔۔وہ مجھے کھیلنے کے لئے بھی نہیں لے جاتی بلکہ وہ مجھے بورڈنگ سے اٹھا کر ٹیوشن کے مرکز میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔

اب میں سات سال کا ہوں۔۔۔۔دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔بھلا مجھے ٹیوشن کی کیا ضرورت۔۔۔۔۔مگر یہ میری ممی کو کون سمجھائے۔ٹیوشن سینٹر میں بھی مجھے انہی چیزوں پر بور کیا جاتا ہے جو مجھے میری استانی۔۔۔۔اور اسکول کے بعد مدد کرنے والی استانی پڑھا چکی ہوتی ہے۔میری ممی ٹیوشن سے گھر لاتے ہوئے راستے میں مجھ سے پوچھتی ہے۔۔۔ٹیوشن میں مزا آیا۔۔میں جانتا ہوں اگر میں نہیں کہونگا تو وہ ناراض ہوجائیں گی۔۔۔مجھے نیند آرہی ہے۔۔۔اب گھر جاتے ہی میں سوجاؤنگا۔۔۔کل صبح پھر اٹھنا ہے۔۔۔۔

(۲۷)

خطبہء جمعہ

مسجد کے نیچے رحمو پان شاپ پر کھڑا میں سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میرے کانوں سے خطیبِ مسجد کی آواز برابر ٹکرا رہی تھی۔ جو قبلِ خطبہ جمعہ تقریر کر رہا تھا۔

مسجد کے نیچے اس پان شاپ کا فائدہ یہ تھا کہ یہاں کھڑے کھڑے دین و دنیا دونوں سے فیض یاب ہوا جا سکتا تھا۔ سامنے خواتین کا کالج بھی تھا۔ سیرِ نگاہ کے لئے اس سے بہترین مقام اور کہاں ہو سکتا تھا۔

مسجد کا امام بڑی دھواں دھار تقریر کر رہا تھا۔ وہ اپنے من پسند موضوع یعنی دوزخ کی آگ اور جنت کی حوروں پر لیکچر دے رہا تھا۔ ''رحمو بابا!''۔ میں نے پان والے کو ٹوکا جو نئے پان لگا لگا کر رکھ رہا تھا، تاکہ بعد نماز رش کے وقت سہولت بھی ہو اور پان ذرا تیز بھی ہو جائیں۔

''کیا ہوا''۔ اُس نے کھر کھراتی آواز میں جواب دیا۔

''یہ بتاؤ''۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ مسجد کے مولوی آخر دوسرے موضوع پر کیوں نہیں گفتگو کرتے۔ سیاست پر، معیشت پر..... علمی مسائل پر۔''

''ہوں! چار جماعتیں کیا پڑھ لیں کہ تیرا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔'' رحمو بابا بڑبڑایا۔

''اپنے ساتھ مسجد کے مّلا کو بھی جہنم میں لے جائیگا کیا؟ جا جا کر خطبہ سن صرف دو رکعت ڈھالنے سے تجھے جنت کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہ ہوگا۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سگریٹ کا آخری کش لیکر اسے پاؤں کے نیچے مسل ڈالا، اور

لپک کر مسجد میں داخل ہو گیا۔

خطیب کا خطبہ اسکی عربی زبان دانی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بے شمار نمازی جھوم جھوم کر سن رہے تھے۔ آخر خطبہ ختم ہوا اور صف باندھی جانے لگی۔

میں نے دیکھا کہ میرے برابر والا شخص کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ آخر میں نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ ہڑ بڑا کر آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔ نماز طویل نہ تھی۔ ختم ہوئی۔ اس کے بعد امام زار و قطار دعائیں مانگنے لگا۔ لوگوں نے آمین تحسین کے ڈونگرے برسانے شروع کر دیئے۔ میں عربی سے نابلد ہی تھا پھر بھی آمین کے کلمات میرے منہ سے بے ساختہ نکل رہے تھے۔

اچانک ایک خیال نے مجھے بے چین کر دیا میں نے اپنے اِرد گرِد، چاروں طرف دیکھا ہر طرف سے آمین آمین ہی کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا میرے پلّے تو کچھ پڑھ ہی نہیں رہا۔ اور یہ امام نہ جانے کن کن باتوں پر اوروں کی طرح مجھ سے بھی آمین کہلوا رہا ہے۔

میں آہستہ سے اٹھا۔۔ سامنے رکھی چپل بغل میں دبائی۔۔ اور وہاں سے کھسک گیا۔۔۔۔۔

(۲۸)

لذت

ہی ہی ۔۔۔مسافر کے باہر نکلتے ہی ٹام نے ایک گندی سی گالی کے ساتھ ہنسنا شروع کر دیا۔ڈیوڈ بھی اسکا ساتھ دے رہا تھا۔۔۔ہا۔۔ہا۔۔''پر۔۔۔مزا نہیں آیا''۔۔وہ قہقہہ لگاتے رک کر بولا۔۔۔''اس سالے موسلے نے نہ شکایت کی نہ احتجاج۔۔۔بس چپ چاپ تلاشی دیکر نکل گیا۔۔۔''

''یہ تو ہے۔۔'' ٹام نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔اور ڈیوڈ اپنے گلے میں پڑے ستارے کی شکل کے لاکٹ کو چومتے ہوئے بولا ''ایک ترکیب ہے کسی موسلے کو چڑانے کی''۔

''وہ۔۔کیا؟''ٹام نے بیتابی سے سوال کیا۔ وہ اپنی انگلیوں سے برابر گلے میں پڑی چین میں لٹکی صلیب سے کھیل رہا تھا۔

''کتے سے سنگھوا کر تلاشی لو'' ڈیوڈ۔۔۔نے ایک شیطانی تبسم لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔۔۔

''ارے اس میں تو لذت ہے نہ کہ پریشانی۔۔۔ہماری۔۔عورتیں تو۔۔''ٹام کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ ڈیوڈ پھر بول پڑا۔

''ہے اس میں پریشانی۔۔۔یہ موسلے کتوں سے بہت بدکتے ہیں کیوں کہ ان کے مذہب۔۔۔۔۔۔''

وہ کہتا رہا۔۔۔

''ارے تو اس میں کیا قباحت ہے''۔ڈیوڈ کی مکمل بات سنکر ٹام نے کہا۔

''بھئی اپنے افسر کے سامنے منشیات کے جسم میں چھپائے جانے کا جواز پیش کردینگے۔تھوڑا تنگ کرنے کا مزہ بھی آئیگا اور۔۔۔ترقی کے امکانات بھی بڑھ جائینگے۔۔۔۔

چند ہفتوں بعد ہی ایک دوسرا افسر،ڈیوڈ اور ٹام کی معیت میں باس کے سامنے کھڑا تھا۔

''سر۔۔۔ان دونوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ایک مسافر کو ہراساں کیا ہے۔''

افسر اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوگیا۔

''ہوں۔۔۔کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو۔۔۔۔باس نے بات شروع کی۔۔تم دونوں تو بہت محنتی افسر مانے جاتے ہو۔''

سس۔۔سس سر وہ ہم نے منشیات کے شبہ میں ایک فرد کی تلاشی۔۔۔مم۔۔مگر اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا۔۔۔

بب بس یہی ہمارا قصور۔۔۔لل۔۔لیکن''۔۔ڈیوڈ ہکلا رہا تھا کہ باس نے بات ختم کردی۔

'ظاہر ہے اگر تم ایسا نہ کرو تو مجرم۔۔۔پکڑے جائیں گے کیونکر۔۔۔۔''

پھر باس۔۔۔ان دونوں کو اپنے سامنے پیش کرنے والے افسر سے مخاطب ہوا۔

'یہ دونوں ماضی میں بہت فرض شناس رہے ہیں۔ان کو ایسا کرو۔۔۔۔جسم کے مکمل اسکیننگ کے ڈپارٹمنٹ میں بھیج دو۔''

'لل۔۔۔لیکن سر۔۔۔افسر نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔''

'جو میں نے کہا۔۔۔۔وہ کرو۔۔باس نے تلخی سے کہتے ہوئے سبھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔۔۔۔

❁❁❁

(۲۹)

سانجھے کی بیوی

دوبئی کے اس فلیٹ میں جہاں وہ رہتا تھا تین کمرے تھے۔اور چھ باسی۔جب وہ نیانیا آیا تو اسے اسی فلیٹ میں ایک کمرے کا ایک کونا ملا۔اس کی اپنی الماری بھی تھی جس میں وہ چابی لگا سکتا تھا۔اسی فلیٹ میں اس نے عرصہ بتا دیا۔فلیٹ کے باسی بدلتے رہے یہاں تک کہ صرف وہی سب سے پرانا کرایہ دار ہو گیا۔اب وہ دوسرے سارے کرایہ داروں کا سربراہ بن چکا تھا۔یعنی مالکِ مکان کو تمام کرایہ داروں سے کرایہ وصول کر کے بھیجنے کی ذمہ داری اُسی کی تھی۔اور یوں کسی جگہ کے خالی ہونے پر وہ خود ہی نئے کرایہ دار کو تلاش کر کے اُسے پُر کرتا۔اُس نے کمرے کے ایک کرایہ دار کے جانے کے بعد کمرا صرف اپنے استعمال میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔وہ اس کونے کو خالی رکھ کر اپنی زندگی کا خالی کونا بھرنا چاہتا تھا۔پورے فلیٹ کا تنہا وہ کرایہ برداشت کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔مگر شادی کر کے بیوی کو لانے کی آرزو بھی اس کے دل میں مچل رہی تھی۔اور پھر وہ اپنی بیوی کو بھی اس سانجھے کے فلیٹ میں لے آیا۔اس نے بیوی کو رسوئی دکھاتے ہوئے کہا کہ تم کھانا پکانے کچن میں صرف اسوقت آنا جب میں گھر پر موجود ہوں۔اس کی بیوی خاصی سمجھدار نکلی۔اور بولی ہاں میں بھی پڑھائی کے دوران ہاسٹل کی سانجھی زندگی دیکھ چکی ہوں۔دن مہینے گذرتے رہے۔اور فلیٹ کی زندگی بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے آگے بڑھتی رہی۔ایک دن وہ کام سے جلدی لوٹا تو اس نے دیکھا کہ بیوی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اور مکین سے گپ بھی لڑا رہی ہے۔وہ بھی وہیں رک گیا۔اور بولا کچھ نہیں۔

کھانے سے فارغ ہوکر جب وہ دونوں کمرے میں آ کر لیٹے تو اس کی بیوی اس کے خراب موڈ کو دیکھ کر بولی اب اس میں ایسا کیا برا ہے۔ میں جب ہاسٹل میں لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھی تو وہ میری چیزیں میرے منع کرنے کے باوجود استعمال کر لیتی تھیں۔ شروع شروع میں میرے ڈر سے مجھے بتائے بغیر۔ دھیرے دھیرے مجھے پتہ چل گیا تو مجھے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ اکٹھے رہنے میں سب کچھ باٹنا پڑتا ہے تب ہی لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔

اب تم ایسا نہیں چاہتے ہو تو پھر ہم کسی دوسرے فلیٹ میں چلے جاتے ہیں جہاں کوئی ساجھے دار نہ ہو۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔۔۔اور منہ گھما کر سو گیا۔ اب وہ ہمیشہ وقتِ مقررہ پر ہی گھر لوٹا کرتا۔

(۳۰)

غیرت مند بے غیرت

''**تم چاہتی** کیا ہو۔۔۔؟'' بارعب باریش شخص نے اپنے سامنے کھڑی کافی کم عمر لڑکی سے سوال کیا۔۔۔ درحقیقت وہ آدمی اس سے سوال نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کا درشت لہجہ اسے تنبیہ کر رہا تھا کہ وہ بعض آ جائے ورنہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔۔۔۔۔

لڑکی اٹھی اور بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔۔۔

''ارے آپ نے یہ کیا کیا۔۔۔'' لڑکی کے جانے کے بعد وہاں بیٹھے ایک اور شخص، جو کہ

ایک بڑے سے تخت پر بیٹھے اس بارعب شخص کے قدموں میں زمین پر بیٹھا تھا،۔۔نے کہا ۔۔۔۔۔۔ریشمی عبا میں ملبوس گاؤ تکیے پر نیم دراز شخص کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔۔۔۔

''اس کے بھائی کو بلالاؤ۔۔۔۔'' تھوڑی دیر بعد ایک سہا ہوا لڑکا اسی طرح اس بارعب شخص کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔

''تم سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہونا'' تخت نشین نے لڑکے سے سوال کیا۔۔۔

''جی جی۔۔۔میرے لئے کیا حکم ہے۔۔۔''؟ لڑکے نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''تمہاری غیرت کیا کہتی ہے۔کیا یہ سب اب ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔۔۔''؟

''جی حضور بالکل ہونا چاہیے'' لڑکا منمنایا۔۔۔۔۔

''تو ٹھیک ہے جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہو جائے گا۔۔۔مگر کیا تم اس بہادری۔۔۔۔۔اس عزت کی
بحالی کے کارنامے کو اپنے سر لینے کے لیے تیار ہو۔۔''؟ تخت پر بیٹھے شخص۔۔۔نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔۔۔اور تخت سے اتر کر ٹہلنے لگا۔۔۔۔۔

''حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر'' کہہ کر لڑکا اس کے پیر چھونے کو اس کی طرف بڑھا۔۔مگر اس بارعب شخص نے ہاتھ ہلا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ جا سکتا۔۔۔اور لڑکا پیچھے ہٹنے لگا۔۔۔۔اس سے قبل کہ وہ کمرے سے باہر جاتا۔۔۔۔بارعب شخص نے لڑکے کو پھر سے مخاطب کیا۔۔۔۔

''سنو۔۔۔۔جب مستان تم سے کہے تم فوراً پولیس کے پاس جا کر وہی کچھ کہہ دینا جو تمہیں مستان سمجھائے۔۔''

''جی بہتر'' کہہ کر لڑکا کمرے سے نکل گیا۔۔۔۔لڑکے کے جاتے ہی مستان وہاں سے اٹھ

گیا۔۔۔۔۔۔

❁ ❁ ❁

(۳۱)

مقید کہانی

افسانہ نگاری اور کہانی نویسی کا مقابلہ جاری تھا۔
بہترین مصنف کو ایوارڈ دینے کے لئے جیوری تشکیل دی گئی تھی۔ جس کے سامنے ہر مصنف اپنی اپنی کہانی پڑھ کر سنانے کے بعد کہانی کے اہم پہلوؤں پر توجہ بھی مرکوز کرا رہا تھا۔
ایک مصنف نے کہا'' میں اپنی کہانیوں کو ٹھیک سو لفظوں میں قید کر کے پیش کر سکتا ہوں''۔
دوسرے نے تاویل پیش کی۔ ''جناب میری کہانیاں صرف دس لفظوں میں مقید، بلا چوں و چراں ہر روز مجھ پر نازل ہو جاتی ہیں۔ میں جب چاہوں، جہاں چاہوں اور جیسے چاہوں اُسے پیش کر سکتا ہوں۔
سب سے آخر میں جیوری کے سربراہ کی نگاہ آخری صف کے ایک کونے میں بیٹھے ایک شخص پر پڑی۔
اُس نے آدمی سے پوچھا۔'' آپ بھی۔۔۔۔۔۔کچھ کہیں۔۔آپ کیا لکھتے ہیں؟
وہ شخص اِس اچانک سوال سے ایکدم گھبرا گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ہی مخاطب ہے تو دھیمے لہجے میں بولنے لگا۔
''حضور معاف کیجئے گا یہاں تو سارے مصنفین اپنی اپنی کہانیوں کو لگام دیئے، قید کئے بیٹھے

ہیں۔مگر میرا معاملہ الٹ ہے۔

دراصل میں خود ہی اپنی کہانیوں کا قیدی ہوں۔کہانیوں نے مجھے قید کررکھا ہے۔جب ان کی مرضی ہوتی ہے۔مہربان ہوجاتی ہیں۔جتنےلفظوں میں چاہتی ہیں اترتی ہیں۔کبھی پانچ تو کبھی پانچ سولفظوں میں۔

جب آتی ہیں تو مجھے ہرطرح کی اذیت دیتی ہیں۔اور جب نہیں آتی ہیں،تو میں اُس کے انتظار کی اذیت میں مبتلا ہوجاتا ہوں۔

(۳۲)

اجنبی

’’ **خداوند** یہ رنگدارنسل کا باشندہ دراصل ہجرت کرکے ہماری سرزمین پرآبسا تھااورمر نے کے بعداس کے وُرثا کے نہ ہونے کے سبب اسے دفن بھی ہماری سرزمین پرکردیا گیا تھا۔ اب جب سورِاسرافیل پھونکا گیا ہےتو یہ ہماری امت کے ساتھ بھیڑ بھاڑ میں یہاں آپہنچا ہے۔‘‘

خداوند کے دربار میں ایک اجنبی اورسب سے مختلف نظرآنیوالے شخص کا کیس پیش کرتے ہوئے فرشتے نے کہا۔

’’ہمیں معلوم ہے‘‘ غیب سے آواز آئی۔

''دراصل یہ ہمارے چہیتے رسول کی امت سے ہے،اور ہم سوچ رہے ہیں کہ اسے ہم کہاں رکھیں۔''

''لل لیکن خداوندِ خدا۔۔۔'' فرشتے نے تاویل پیش کرنا چاہی۔۔اور ہکلاتے ہوئے بولنے لگا

''دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔ہماری امت کے لوگ اس فرد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے، وہ کہتے ہیں اس کا۔۔رنگ ۔۔۔۔اوراس کے ڈھنگ ہماری طرح سے نہیں۔پھ۔۔پھر یہ کہ ہمیں اس کے نامہءِ اعمال کا بھی کچھ پتہ نہیں ہم کس طرح اِسے جنت یا دوزخ میں بھیج سکتے ہیں۔'' فرشتہ خاموش ہوا تو اسے جواب ملا۔۔۔

'' ہمیں سب معلوم ہے ہمیں، یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔'' کچھ توقف کے بعد غیب سے پھر آواز آئی ''یہ اپنے منکر نکیر سے بچھڑ گیا ہے۔۔۔۔'' ۔۔۔۔کچھ دیر کی خاموشی کے بعد۔۔

غیب کا حکم ہوا!

اور پھر اس شخص کو بتایا گیا کہ وہ خدا کے دربار سے باہر ایک کونے میں بیٹھ جائے اور انتظار کرے۔۔۔۔جب اس کی امت کے تمام افراد کے کیس خدا کی عدالت میں پیش ہونگے تو اسے بھی بلایا جائے گا۔اور جب ہی اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

(۳۴)

کوک

''**کوک** پینے چل رہے ہو۔؟''میں آوازسن کر پلٹا،میں دوکان پرکھڑاسوادالے رہا تھا۔اوروہ دونوں گرومندرجارہے تھے۔

''نہیں تم لوگ جاؤ۔''میں نے جواب دیا۔''چلویارنخرے نہ دکھاؤ۔''میرے انکارپروہ بولا۔

''ایسابھی کیاکہ تم کوک پینے میں بھی ہماراساتھ نہ دو۔''

'' نہیں یاردراصل مجھے کچھ کام ہے۔پھرتمہاری کزن بھی شایدایسانہیں چاہتی۔''

میں نے اِس کے ساتھ لاتعلق سی کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں تمہیں کچھ اعتراض ہے۔''میرے جواب پراس نے اپنی ساتھی سے پوچھا۔

''نہیں بھیا!بھلامجھے کیااعتراض ہوسکتاہے۔''لڑکی نے پہلی بارزبان کھولی۔

''یعنی خوامخواہ۔''میرے دوست نے ہاتھ نچایا۔''اب چلوبھی۔''اورمیں جبراًساتھ ہولیا۔راستہ کچھ یوں کٹاکہ وہ دونوں آگے آگے مجھ سے کچھ فاصلے پرباتیں کرتے ہوئے جارہے تھےاور میری حیثیت اس شوفرکی سی تھی جومالکوں کوبغیرگاڑی کے کہیں پیدل لے جارہاہو۔اورایسے میں اسکی اہمیت صفرہوگئی ہو۔گاڑی ہوتوپھربھی اس کی کچھ اہمیت ہوتی ہے کہ ڈرائیونگ سیٹ پرہوتا ہے۔

کوک پینے کے بعدوہ بولا۔''ہم تواس طرف جائیں گےتم اب جاؤہمیں کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔'' ''اچھاٹھیک ہے'' میں نے کہااوروہ دونوں تیزتیزچلتے ہوئے میرے سامنے پھیلےاندھیرے میں مدغم ہوگئے۔اورمیں کھڑاسوچتارہا۔یہ لوگ مجھےکوک پلانے لائے

تھے۔۔۔۔لیکن شاید کوک مجھے پی گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

❁❁❁

(۳۴)

بلاسودی نظام

قہقہہ لگاتے شخص نے درمیان میں رک کر برابر والے کے کان میں سرگوشی کی اور قہقہہ لگانے لگا۔۔۔ہی ہی ہاہا۔۔۔

''ذرا ہم بھی تو سنیں ایسی کون سی مزیدار بات تم دونوں کر رہے ہو۔'' بادشاہ سلامت کی آواز سن کر قہقہہ لگاتے شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''عالیجاہ۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔وزیر باتدبیر کا خیال ہے کہ اقتصادی ترقی کے لئے ہمیں بلاسودی نظام رائج کر دینا چاہیے۔''

''ہمیں وزیر باتدبیر پر اعتماد ہے۔اس نے یہ تجویز پیش کی ہے تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی کی ہوگی۔'' بادشاہ سلامت بولے۔

''لل۔۔لیکن حضور ہمارا کیا ہوگا عالیجاہ۔۔! آپ کے اور ہمارے رشتہ داروں اور ہم جیسے لوگوں کا کیا بنے گا۔۔۔۔ان کا دانہ پانی۔۔'' شخص گڑگڑانے لگا۔

''درست! کیوں وزیر تمہارے پاس اس کا کوئی حل ہے یا ہمیں ان کی پرواہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔'' بادشاہ سلامت وزیر سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں حضور۔۔۔ہمیں اپنی حکومت کے لئے ان لوگوں کی حمایت اور عوامی ہمدردی دونوں ہی کی ضرورت ہے۔۔''

''مطلب کی بات کرو۔'' بادشاہ نے وزیر کوٹوکا۔

''حضور آسان اور سیدھا ساحل یہ ہے کہ ہم اور یہ تمام لوگ اپنا سرمایہ ملک سے باہر منتقل کر دینگے اور بوقت ضرورت وہیں سے استعمال میں لائیں گے۔'' وزیر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔اور بولا۔

''ہمیں تم سے اتفاق ہے۔نئے نظام کو متعارف کرانے اور سرمایہ کی منتقلی کا کام ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔'' تالی بجا کر بادشاہ نے دربار برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

❁❁❁

(۳۵)

گورکن

''مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دو۔'' گورکن گھگھیاتے ہوئے بولا۔

''تم نے بہت زندگی گزار لی۔ستر برس اب بھی تم میں جینے کی خواہش ہے۔'' موت کے فرشتہ نے حیرانی سے کہا۔

''نہیں۔۔۔نہیں ۔۔۔مجھے اب جینے کی تمنا نہیں۔لیکن ۔۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے قبل اپنی قبر خود تیار کرلوں۔بس اتنی سی مہلت چاہیے۔'' گورکن گڑگڑایا۔

''اچھا۔۔'' موت کا فرشتہ راضی ہوگیا اور بولا۔

''تمہارا کوئی وارث نہیں۔''

''نہیں۔'' کہہ کر بوڑھا گورکن اپنے نحیف ہاتھوں سے جلدی جلدی پھاوڑا اچلانے لگا۔کچھ دیر بعد قبر تیار ہوگئی۔گورکن اس میں جا کر لیٹ گیا اور آواز لگا کر موت کے فرشتے سے مخاطب ہوا۔

''ہاں !اب تم میری روح قبض کر سکتے ہو۔''

''مگر ایک بات تو بتاؤ'' موت کے فرشتے نے قبر کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا

''تمہارے کفن دفن کا انتظام کون کریگا؟''

''وہ۔۔ وہ۔۔۔!!'' گورکن ہکلایا۔

''دیکھو کفن کا لٹھا میری جھونپڑی میں پڑا ہے۔اور کفن دفن کا انتظام قبرستان آنے والوں میں سے کوئی ضرور کر دے گا۔بھلا اتنا بھی نہ کرے گا کوئی میں ساری عمر لوگوں کی خدمت کرتا رہا ہوں''

موت کے فرشتے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اسکی روح قبض کر کے آگے چلدیا۔

دوسری صبح جب موت کا فرشتہ اسی قبرستان کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ گورکن کی لاش

کھدی ہوئی قبر سے باہر پڑی ہوئی تھی۔چندلوگ اپنے مُردے کو دفنانے اور اس قبر کو حاصل کرنے کے لئے جھگڑ رہے تھے۔

(۳۶)

شادی کی محبت۔۔۔۔۔

وہ باہر جانے کو تیار کھڑا تھا۔ مجھے چھوڑ کر جانے کو۔۔۔

وہ کہہ رہا تھا اگر تم چاہو تو میں رک جاتا ہوں لیکن یہ رکنا صرف ایک مصلحت ہوگی۔ ایک معاہدہ ہوگا۔۔ محبت نہیں۔۔۔

تمہیں یاد ہوگا ایک دفعہ میں نے تمہیں روکا تھا لیکن صرف اور صرف محبت کے لئے۔۔

وہ جانے اور کیا کیا بولتا رہا۔

اور میں سوچ میں گم تھی۔ ہماری شادی محبت کی شادی تھی۔ جبکہ میرے بھائی کی شادی اس کی پسند کے برعکس والدین نے خاندان میں کر دی تھی۔ میری بھابھی شکل وصورت کی عام سی مگر سلیقہ منداور پڑھی لکھی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ بھائی کی پسند نہیں تھی بلکہ بھائی کسی اور کو پسند کرتا تھا۔ اُس نے اِس بات کو قبول کر کے بھائی کی اِتنی دلجوئی کی اُس کا اتنا خیال رکھا کہ بھائی کہتا۔ ''میری محبت کی شادی نہیں۔۔۔ مجھے شادی کی محبت ہے'' بھائی اُس کا نام لینے کے بجائے اُسے 'شادی' کہتا تھا ۔

میں اپنی بھابھی کے برعکس تھی۔ میں نے سوچا میں اتنی خوبصورت ہوں، پڑھی لکھی ہوں، تب ہی وہ مجھ پر مرتا ہے اور اپنے والدین، بھائی بہن سبھی کو میری خاطر چھوڑنے پر تیار ہے۔

شاید اِس لئے وہ میری جائز ہی نہیں ناجائز خواہشات بھی پوری کرے گا۔ وہ جتنا میرے لئے کرتا میں اُسے کم سمجھتی۔۔۔ اُسے اپنے سے کم تر سمجھتی اور اُسے ہمیشہ یہ یاد دلاتی کہ وہ

میرے لئے کیا کچھ نہیں کرسکا ہے۔ مجھے کبھی یہ یاد نہیں رہتا کہ اُس نے میرے لئے کیا کچھ کیا ہے۔

اور آج وہ مجھے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔۔۔میں نے اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔۔۔

یا شاید میری انا نے۔۔۔!!

(۳۷)

عراقی

عراقی! محلے میں نئی نہ تھی۔نئی بات یہ تھی کہ وہ عین جوانی میں بیوہ ہوگئی۔اسکا خصم بے تحاشہ دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ایک تو جوان اور پھر دولت مند۔اوپر سے خوبصورت اتنی کہ راہ چلتے مردوں کی نگاہیں اس کے جسم سے چپک کر رہ جاتیں۔

غریب تو صرف آنکھیں سینکنے پر ہی اکتفا کرتے لیکن شہر کے کئی ایک متمول افراد نے پیغام بھی بھجوایا۔ان کا خیال تھا کہ دولت اور جوانی کی حفاظت اور دیکھ بھال ضروری ہے اور یہ دیکھ بھال صرف شہر کے متمول افراد ہی کرسکتے تھے۔ جب عراقی نے کسی کی بھی حوصلہ افزائی نہ کی اور سب کے سب پیغاموں کو ٹھکرادیا تو وہ سب کو اپنا دشمن بنا بیٹھی۔وہ سارے کے سارے جو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ترکیبیں کرتے رہے تھے۔ایک سے بڑھ کر ایک لالچ اور دعوت دے رہے تھے۔ مایوسی میں سب ایک دوسرے سے جا ملے۔

متحدہ کے گھر میں ساری قوم جمع ہوئی۔سام،سامراج اور نازی سبھوں نے ملکر یہی پروگرام بنایا

کہ عراقی کو مل جل کر محلے سے نکال باہر کیا جائے یا پھر اس کے گھر میں گھس کر اس کے خوبصورت جسم اور بے تحاشہ مال و دولت پر قبضہ کر لیا جائے۔اور پھر وہی ہوا۔

سام نے ایک رات نقب لگائی،ابھی جبکہ وہ عراقی کو ننگا کر کے اس کی عزت سے کھیلنے کی سوچ ہی رہا تھا، کہ سامراج، نازی اور دوسرے سارے وہاں پہنچ گئے۔انہوں نے طے شدہ پروگرام کے تحت عراقی کو سام کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے موقع پر پکڑ لیا تھا۔اس جرم کی سزا کے طور پر عراقی کا گھر ہر کسی کے لیے کھول دیا گیا۔لوٹ مار کے لیے ہر کوئی آگے بڑھ بڑھ کر اسکا سامان اٹھا رہا تھا۔عراقی گشتی قرار دے دی گئی اور ہر کسی کو اختیار تھا کہ وہ اس کی عزت سے کھیل سکے۔

❋❋❋

(۳۸)

روشن خیالی

ایمبیسی کی سرکاری نوکری، وہ بھی ایک ایسے ملک کی ایمبیسی کی نوکری کوئی آسان تو نہ تھی۔

وہ خود بھی ملازم تھی اور اس کا میاں بھی سفارت خانے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

اور اسے اپنے میاں کے ساتھ یہاں وہاں پارٹی میں بھی جانا ہوتا تھا۔

مشرقی لباس زیب تن کر کے اسے اپنی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرنی ہوتی تھی۔دوسری جانب اسے گوروں کے ملک میں اپنے ملک کی روشن خیالی اور خواتین کی معاشرے میں حیثیت کا پرچار بھی کرنا ہوتا تھا۔ایسا نہ ہو کہ اس کا ملک قدامت پرست اور خواتین کا استحصال کرنے

والے ملک میں شمار کیا جانے لگے۔

آج بھی وہ قطار در قطار اس ثقافتی پروگرام میں آنیوالوں کوخوش آمدید کہنے کے لیے ایمبیسی کے دیگر اسٹاف کے ساتھ ہال داخلی دروازے پر کھڑی تھی۔

اپنی روشن خیالی، ملک کی اعلی اقدار، یورپی تہذیب کے مدِ مقابل خواتین کا معاشرے میں مقام سبھی کچھ تو پیش کرنے کی ذمہ داری اس اکیلی پر آن پڑی تھی۔۔۔۔۔

جسے وہ نہایت خندہ پیشانی سے مسکرا مسکرا کر مہمانوں کوخوش آمدید کہتے ہوئے نبھا رہی تھی۔

وہ تمام گوروں سے ہاتھ ملاتی۔۔۔

مسکرا کر سلام کرتی۔۔

دیسی لوگوں سے وہ محتاط رہتی۔۔کسی سے ہاتھ نہیں ملاتی۔۔

(۳۹)

بزدل

''میں تمہارا جسم نہیں تمہاری محبت حاصل کرنے آیا ہوں! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔''لڑکے نے جذباتی انداز میں کہا۔اورلڑکی کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولی۔''تم بہت بھولے ہو۔''

''یہاں محبت نہیں جسم کا سودا ہوتا ہے۔اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

''میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤ نگا، پھر ہم ایک باعزت زندگی گزاریں گے سمجھیں!۔''
''باعزت ہونہہ ! '' لڑکی نے غصے سے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ اسے لڑکے کی باتوں سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔
''چلے جاؤ یہاں سے۔''اس نے تقریبا چیختے ہوئے کہا۔''تم ایک بزدل انسان ہو۔رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے انسان بہادر نہیں ہوتے ان کے جذبے کی صداقت پر کوئی یقین نہیں کرتا اور ہاں مجھے یہاں سے نکالنے کا خواب بھی مت دیکھو۔ایسی کوشش ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔''
''ہاں میں واقعی بزدل انسان ہوں۔'' لڑکے نے زیرلب کہا۔'' اسی لئے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کررہاہوں۔''
ممکن ہے پولیس کی توجہ تمہیں یہاں سے نجات دلا سکے اتنا کہہ کرلڑکے نے الوداعی نگاہ لڑکی پر ڈالی اور کھڑکی سے چھلانگ لگادی۔۔۔۔۔

(۴۰)

افغانی

افغانی اپنی کم عمری میں اتنے تجربات سے دوچار ہوئی تھی کہ جن تجربات سے شاید کسی کو کئی بار جنم لینے کے بعد بھی سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔

نازونعم کی پلی شاہی خاندان میں پروان چڑھی افغانی، ایک خوبصورت اورالھڑ دوشیزہ ابھی جوانی کی دہلیز پر پہنچی ہی تھی کہ اس کے چچا نے، جوعرصے سے بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا، اپنے بیٹے کے لئے اسکا پیغام بھجوادیا۔اپنی حکومت کو بچانے کی خواہش میں افغانی کا باپ، اس کی شادی کرنے پر تیار ہوگیا۔اور یوں کم سنی میں ہی ناتجربہ کار افغانی محلاتی سازش کی بھینٹ چڑھ گئی۔

افغانی کا شوہرفوج کا سالار بنادیا گیااور پھر کیا تھا۔ملک افراتفری کا شکار ہونا شروع ہوگیا۔
افغانی کے چچا نے پڑوسی ملک کو مداخلت کی دعوت دیکر ملک پر ایک نہ ختم ہونے والے ظلم و بربریت کے دور کا آغاز کردیا۔باشاہ کو ملک بدر کردیا گیا۔افغانی سارے ظلم سہتی رہی۔اس کے ناکارہ اورنااہل شوہر نے اسے چھوڑ دیا۔اس کے بچے پاس پڑوس ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

افغانی کا محل اوروں کا مسکن بن چکا تھا اور وہ خود ایک کونے میں دبکی پڑرہی۔کبھی ایک پڑوسی ملک تو کبھی کوئی اور ملک اسے رہائی کا سندیسہ دیتا اور موقع ملتے ہی لوٹ مار مچادیتا۔
افغانی نے اب بھی ہمت نہ ہاری تھی وہ خاموش لب، آنکھوں میں آنسو لئے دوست دشمنوں کے بدلتے تیوروں کا مشاہدہ کررہی تھی اوراچھے دنوں کی منتظر تھی۔ ❁❁❁

(۴۱)

سنگ تراش

سنگ تراش نے پتھر کوصاف ستھرا کر کے ایک کونے میں رکھ دیا۔اور پھرایک دن اس میز پرلا کر رکھا جہاں پر کھڑے ہوکر وہ اپنے ہاتھ کی مہارت سے کسی بدصورت پتھر کوکسی خوبصورت مورتی کے قالب میں ڈھالا کرتا تھا۔سنگ تراش پتھر کے پاس آ کر ہرروز کھڑا ہوتا اوراس پراپنے ہاتھ کے جوہر دکھانے کے بجائے صرف اس سے باتیں ہی کرتا رہتا۔پتھر ہرروز سوال کرتا۔۔''میری باری کب آئے گی۔کب تو مجھے اپنی مہارت سے خوبصورت مجسمے میں بدل ڈالے گا۔''

سنگ تراش نے، پھرایک دن اس پتھر پرکام کرنا شروع کردیااور بہت محنت اورشفقت سے مجسمہ تیارکرنے لگا۔پتھر۔۔کٹتا رہااور عام بدصورت پتھر سے ایک خوبصورت مجسمے کے قالب میں ڈھلتا رہا۔اس نے مجسمے کونہایت جانفشانی سے ایک انتہائی خوبصورت سی دوشیزہ میں بدل ڈالا۔آنکھیں انتہائی خوبصورت۔۔۔جسم مرمریں۔۔سنگ تراش ابھی مجسمے کو بالکل مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ایک دن جب کہ سنگ تراش وہاں موجود نہ تھااس کا ایک دوست جو کے خود مصور تھا، پتھر کے مجسمے کے پاس،سنگ تراش کوتلاش کرتے ہوئے آن پہنچا۔جب اس نے مجسمہ دیکھاتو وہ سنگ تراش کے فنی مہارت پرعش عش کر اُٹھا۔مگر پھراس کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے مجسمے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجسمہ لاج سے شرما گیا۔آنکھیں پٹ پٹ کر کے نگاہ نیچی کرنے لگا۔دونوں وفورِجذبات میں گھر گئے اورمصور نے مجسمہ کوساتھ چلنے پر

تیار کرلیا اور دونوں وہاں سے چل پڑے۔سنگ تراش جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور ۔۔۔۔۔دوسرا بڑا سا پتھر تھا۔خالی میز پر وہ اس پتھر کو رکھ کر اس کی تراش خراش میں مشغول ہو گیا۔

(۴۲)

سکندرِ اعظم

وہ! سخت ترین سردی جو ہڈیوں میں گھس جائے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔چہار سو پھیلی سفید چاندنی، برف پوش پہاڑیاں۔۔۔جنگل جنگل ہر سُو سفید۔سبز ٹہنیوں پر پتوں اور رنگین پھولوں کے بجائے سفید پھول پتیوں کی مانند اُگے ہوئے برف سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔
اور یہاں ایک ایسے سخت گرم موسم میں جب اُسے درختوں پر سفید سفید پھول اگتے دکھائی دیے تو اُس نے انہیں قریب جا کر دیکھا اور چھو کر خود کو یقین دلایا کہ یہ واقعی سفید پھول ہیں برف نہیں ہے۔دور تک پھیلے ہوئے اس سفید پھول کے کھیت کو دیکھنے کے لیے وہ کئی بار اپنا گھوڑا روک کر اترا اور کئی ایک پودوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔اس نے پھولوں کو اپنی انگلیوں سے مسل کر بھی دیکھا۔
''ارے! یہ واقعی سفید سفید اون اُگے ہیں۔'' وہ بے اختیار بول اٹھا۔
اسے اپنے دیس کی ٹھٹھرتی سردی۔۔۔اور ایسے میں ٹہنیوں پر اُگے برف کے پھول یاد آ گئے جو چھونے سے پانی کے قطروں میں بدل جاتے تھے۔اسے اپنے دیس کی سرد اور تکلیف دہ رات یاد آ گئی۔''ایسی تکلیف دہ رات میں یہ اونی پھول کس قدر آرام اور سکون پہنچانے کا باعث بن سکتے ہیں، یہ روئی کے پھول۔۔۔درخت۔۔۔ان کا مصرف اور حقیقی مصرف تو ہمارے یہاں

ہی ہے۔''اس نے دل میں سوچا۔
اور وہ جان گیا کہ قدرت نے زمین کے آدھے حصے کو ایسی دولت سے مالا مال کیا ہے جو دوسرے آدھے حصے کی پرداخت، عیش وآرام اور ساری سہولتیں بہم پہنچانے کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔
عقل وسُوجھ بُوجھ کو استعمال کرنا ہی اصل میں دنیا کی بادشاہت ہے۔
دنیا اصل میں اس کے اس راز کو جان لینے ہی کی وجہ سے سکندرِ اعظم کہتی ہے۔

❁ ❁ ❁

(۴۳)

کنڈکٹر

''**بابو** صاحب ٹکٹ لے لو۔''
''کنڈکٹر کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا اور بڑے آرام سے جواب دیا۔''ہو چکا''۔
''ہو چکا۔'' میرے جواب کو کنڈکٹر نے منہ چڑانے کے انداز میں دُہرایا۔
''کہاں ہو چکا ابھی تو تم سوار ہوئے ہو اور ٹکٹ بھی ہو گیا، اتنی جلدی''۔کنڈکٹر بولتا رہا۔ بات بڑھ گئی۔کنڈکٹر اصرار اور میں تکرار کرتا رہا۔اس نے ٹکٹ دکھانے کا کہا تو میں نے بڑی صفائی سے یہ کہہ دیا کہ تمہاری بس میں انسان خود کو تو سنبھال نہیں سکتا بھلا ٹکٹ کون سنبھالے گا۔بس میں سوار بہت سے لوگ میری معصومیت اور ظاہری حالت سے مرعوب ہو کر میرا ساتھ دینے لگے تھے۔میرا حوصلہ بڑھ گیا اور پھر میں نے کنڈکٹر سے یہ کہہ کر اسے لاجواب کر دیا کہ
''اگر دوبارہ پیسے لینے ہیں تو میں دینے کو تیار ہوں مگر پہلے یہ قبول لو کہ میں کرایہ ادا کر چکا ہوں''۔

کنڈکٹر میری حمایت میں لوگوں کو دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا۔
اس نے میرے قریب کھڑے ہوئے ایک سہمے سے لڑکے سے جو غالباً کسی گیراج میں کام کرتا تھا کرایہ طلب کیا۔لڑکے نے آہستہ سے کہا۔
''سولجر بازار جانا ہے دس پیسے کم ہیں''۔
کنڈکٹر نے ہاتھ میں لیکر پیسے گنے اور پھر لڑکے کی ہتھیلی پر واپس لوٹاتے ہوئے بولا۔
''رکھوانہی پیسوں سے گھر واپس جانا''۔اتنا کہہ کر وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔گرومندر کے اسٹاپ اتر کر میں نے کنڈکٹر کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ پر تیس پیسے رکھےاور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ ❁❁❁

(۴۴)

قندیل جنت میں

جنت میں خواتین کو ان کے حقوق مکمل طور پر میسر تھے اور سنگھار کی آزادی بھی۔
جو خاتون جس مرد کو چاہتی چن لیتی اپنا شریک عدم۔مردوں پر لازم تھا کہ وہ بلا چوں چراں خواتین کے چناؤ کو قبول کرتے ہوئے اُس خاتون کے ساتھ چلے جائیں جس پر کسی خاتون نے انگلی رکھ دی ہو۔
قندیل نے نعیم کو چنا، داروغہء جنت حیرانی سے سارے معاملے دیکھتا رہا۔چناؤ کے بعد اگلا مرحلہ سنگھار کا تھا۔
نعیم بھی اور مردوں کی طرح ڈریسنگ روم میں کھڑا انتظار کرنے لگا۔دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔دنیاوی بیوٹی پارلر کے پانچ گھنٹے ملک عدم میں پلک جھپکتے گزر گئے۔جو میک اپ دنیا میں

دھونے سے اتر جاتا ہے، وہ جنت میں ابدی ہوتا تھا۔ ہر خاتون کو اختیار تھا کہ آنکھ ناک چہرے کو جتنا چاہے خوب رو اور جیسا اچھا لگے میک اپ کروالے۔

جتنی عمر چاہے اختیار کر لے اور صدا اتنی ہی کی رہے۔ چند لمحوں بعد ایک سو سالہ باوقار شخصیت کی حامل خاتون ڈریسنگ روم سے باہر آئیں۔ چہرے کی جھریاں ان کی مردم شناسی کی غماز تھیں۔ لاٹھی ٹیکتی، چال میں لڑکھڑاہٹ دنیا میں کیے تجربے کا منہ بولتا ثبوت۔

نعیم ایک نظر ڈال کر پھر تصور میں گم ہونے والا ہی تھا کہ بڑھیا نے اس کی طرف اشارہ کیا اور تلخی بھرے لہجے میں چھڑی سمیت ہاتھ اٹھا کر انگلی سے نعیم کی طرف اشارہ کیا۔

اور نعیم سے بولی۔ ''چلو! گھر چلو۔''

(۴۵)

غلطی

شمشیر نے خبر ہی ایسی سنائی تھی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ میں اسکا ہاتھ پکڑ کر سامنے مسجد میں گھس گیا۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ میں اسے دکھایا کہ کس طرح وضو کرتے ہیں اور پھر ہم جلدی سے نماز میں شامل ہو گئے۔

نماز کے بعد ہم نے مولوی صاحب کو اپنا مدعا سنایا۔ وہ الٹا ہم پر برس پڑے۔ کیا حماقت ہے ایک غیر مسلم کو لیکر مسجد میں داخل ہو گئے ہو۔ پتہ نہیں ہے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

شمشیر نے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ بولنے لگا ''مولوی صاحب معاف کیجئے گا یہ اقبال کی نہیں میری غلطی ہے۔ مجھے اس طرح سے منہ اٹھائے یہاں نہیں چلے آنا چاہیے تھا۔ بس

غلطی ہوگئی ہم ابھی فوراً چلے جاتے ہیں۔‘‘

’’ہاں آئندہ احتیاط کرنا۔۔۔مولوی صاحب ہم لوگوں کی جان بخشی پر تیار ہوگئے۔

مسجد سے نکل کر شمشیر مجھے گھسیٹتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔تھوڑی دیر بعد ہم ایک گر دوارے میں داخل ہورہے تھے۔شمشیر نے مجھے بتایا۔’’دیکھ اس طرح سے سر کو ڈھانپ لے نا اور ہاں پرساد بٹے تو دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر لینا۔‘‘ میں نے کہا۔’’ہاں جیسے ہم دعا مانگتے ہیں۔‘‘

بعد میں شمشیر نے سنت صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔

سنت نے ہمیں دلاسہ دیا اور کہنے لگا۔’’ہم لوگ تو بس تمہارے دوست کے لیے دعا کر سکتے ہیں آؤ سب ملکر شنکر لال کی صحت کی دعا کریں۔‘‘ سنت نے زوردار آواز سے پکارا اور گردوارے میں سب عبادت کرنے والے اس دعا میں شامل ہوگئے۔

❁❁❁

(۴۶)

غزا

ارافیل بہت جلاد قسم کا شوہر تھا۔نہ بیوی کو طلاق دیتا نہ اسے مار پیٹ کر ادھ موا کرنے سے باز آتا۔دراصل اسے بیوی کو اذیت دینے میں لطف آنے لگا تھا۔وہ ایک ذادسشت بن چکا تھا۔

بے چاری غزا ہر بار پٹتی اور سہہ جاتی۔شور مچاتی محلے والوں سے داد رسائی مانگتی مگر ہوتا یہ کہ ہر بار محلے والے بیچ بچاؤ کے نام پہ ارافیل کی زیادتی کو نظر انداز کر کے غزا کو میل جول سے رہنے کا

سبق پڑھا کر بہلا پھسلا کر گھر بھیج دیتے۔اوراس پر بھی کافی نہ ہوتا غزا کو مجبور کرتے کہ وہ شوہر کی تابعداری کرے اوراسے خوش رکھے۔

ایک بار تو ارافیل نے غصے میں جبر کی انتہا کردی۔گھر میں ہنگامہ کھڑا کیا اور بیوی کو پیٹتے پیٹتے لگا بےضرر بچوں کی دھنائی کرنے۔بچوں کو زخمی کرنے سے بھی دل نہ بھرا تو باورچی خانے میں توڑ پھوڑ کرنے لگا۔

پھر جب بہت ہو چکا تو۔۔۔تھک ہار کر خود تو باہر چلا گیا اور کسی عالیشان رستوراں میں بیٹھا محلے کے چند دوستوں کی معیت میں مرغن اڑانے لگا۔

۔۔۔۔۔بے چاری غزا بھوکے پیاسے بچوں کے زخم اور پیٹ بھرنے میں جٹ گئی۔

محلے والے ایکبار پھراس کی دلجوئی کے نام پر ارافیل کی زیادتی پر پردہ ڈالنے کو پہنچ گئے تھے۔ ان میں پیش پیش وہی تھے جو تھوڑی دیر پہلے اس کے شوہر کا نمک کھار ہے تھے۔

(۴۷)

لائٹ ہاؤس

رات کے اندھیرے میں روشنی کا مینارہ، لائٹ ہاؤس ہر آتے جاتے جہاز کو راہ دکھاتا اور ملاح اور کپتان اس کے شکر گزار ہوتے۔اس رات بھی ہمیشہ کی طرح سناٹا اور ہو کا عالم تھا کہ اچانک نیوی کی گشتی لانچ کی آواز نے سکوت توڑ دیا۔لہروں کی ہلچل سے لائٹ ہاؤس بھی نہ بچ سکا، اٹھتی لہریں اس سے اپنا سر ٹکرانے لگیں اور پھر واپس پلٹ کر پھر سے ٹکرانے کی تیاری کرنے لگیں۔

ہارن کی آواز اور لانچ کے انجن کا شور بتا رہا تھا کہ قریب ہی کوئی نیوی کی لانچ کسی اسمگلروں کی کشتی کا پیچھا کر رہی ہے۔ تیزی سے قریب آتی لانچ کی آواز کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی اور لانچ کا تیز روشنی پھینکتا لیمپ بجھ گیا۔

گشتی لانچ کا عملہ اندھیرے میں صرف کشتی کی آواز سے اندازہ لگا کر اسمگلروں کی کشتی کی سمت کا تعین کر رہا تھا۔ اچانک لائٹ ہاؤس کا گردش کرتا روشنی کا ہالہ سمندر کے پانی پر پڑا اور اسمگلر وں کی کشتی اس کی روشنی میں نہا گئی۔ گشتی عملے کو سنہری موقع مل گیا۔ ہاتھ سے نکلتے شکار کو ایک بار پھر سے جکڑنے کا۔

کچھ دیر بعد ہی ہتھکڑیوں سے بندھے اسمگلروں کی قطاریں لگیں تھیں اور لائٹ ہاؤس نے اپنا حق ایک بار پھر سے ادا کر دیا تھا۔

(۴۸)

پالتو بھیڑیئے

"ایسے کیسے بیٹھ رہی ہو ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھو"۔ اس کے شوہر نے اسے ٹوکتے ہوئے جھڑک دیا۔

" مگر کیوں"؟ اس نے احتجاجاً" سوال کیا۔

"اس لیے کہ تم لڑکی ہو۔ یوں ٹانگیں کھول کر بیٹھو گی تو پھر کل کلاں کو تم آزادانہ خود بھی موٹر سائیکل چلانے کی خواہش کر بیٹھو گی۔

تم لڑکیوں کوصرف اپنے شوہروں اور مالکوں کے سامنے ٹانگیں کھولنی چاہیے۔"

شوہر نے بات مکمل کرتے ہوئے نہایت بیہودہ سا قہقہہ لگایا۔

"تم اپنادماغ کھولو۔۔۔اورعورتوں کی ٹانگوں سے آگے کی بھی سوچو۔دنیا کے اور بھی مسائل ہیں۔"اس کی بات میں شدید الجھن اورنفرت درآئی تھی۔

وہ موٹرسائیکل پرسوار ہونے کی بجائے پیدل چلنے لگی۔وہ بھی چپ چاپ اپنی رینگتی موٹرسائیکل کواس کے پیچھے ڈال کر چلنے لگا۔۔۔

ابھی وہ کچھ دور ہی گئی تھی اور موٹرسائیکل سے ذرا ہی فاصلے پرتھی۔۔۔۔کہ وہ ڈر کر تیزی سے پلٹی اورمیاں کی رینگتی سائیکل پرسوار ہوگئی۔

دوسری طرف سے دو بھیڑیے اس کی طرف لپکتے ہوئے آئے مگر پھر موٹرسائیکل اور سوار کو دیکھ کر بھاگ گئے۔

(۴۹)

گناہِ کبیرہ

''آمِی تُمار کے چھاڑ بونا۔''

میرے سینے پرسوار شخص نے اپنے چمکدار چھرے کی نوک میری گردن پرچبھوتے ہوئے کہا تو میرے سامنے موت ناچنے لگی۔

''مم مگر۔۔ہمارادوش تو بتاؤ۔۔۔تم کیوں مجھے مارڈالنا چاہتے ہو۔''میں نے لڑکھڑاتی زبان

میں جرح کیا۔

"دوش۔۔"اُس نے میرے جملے کودہراتے ہوئے غصے سے مجھ پرتھوک دیااور بولا۔

"دیکھومیری آنکھوں میں۔۔تمہارے لئے کونسا جذبہ ہے۔بس یہی تمہارادوش ہے۔"

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا وہاں سوائے نفرت کے اور کچھ نہ تھا۔میں چند لمحے اسے تکتا رہا۔پھراچانک میرے منہ سے بے تحاشہ قہقہہ بلند ہونے لگا۔میں پاگل وحشی کی مانند قہقہہ لگا رہا تھااور ساتھ ہی ساتھ چیختا جار ہاتھا۔

"ہاہانفرت کی سزاضرور دو مجھے۔۔۔ہاں ہرنفرت کرنیوالے کو۔۔۔۔انسانوں سے نفرت کرنیوالے کوضرورسزاہونی چاہیے۔"میری کیفیت دیکھ کر مجھ پرسوارشخص حیران ہورہا تھا۔ وہ سمجھا میں موت کے خوف سے پاگل ہو چکا ہوں۔وہ میرے سینے سے اترااور پھرایک طرف کو چلدیا۔۔۔

(۵۰)

ویزا

"لے بابا! "۔میں نے اسے پچاس پیسے کا سکہ دیتے ہوئے کہا۔

اُسنے بڑی حقارت سے مجھے دیکھا،جیسے میں نے اسکی توہین کردی ہو۔پھر میں نے ایک روپیہ نکالا،دوروپے بڑھائےمگر ہر باروہ مجھے دیکھ کرلاتعلقی سے سر جھکالیتا۔زبان سے کچھ نہ بولتا......عجیب فقیر ہے میں نے دل میں سوچا ذراپتہ تو چلے موصوف کا ریٹ کیا ہے۔یہ کہہ کر

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''ہاں کتنا لوگے؟ ''میں نے پوچھا۔میرے سوال پراسنے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ایک...میں حیران رہ گیا۔پتہ نہیں کیا چاہتا ہے۔

''کیا ایک؟''

میں نے پھر پوچھا۔میرے سوال پر وہ کچھ دیر تک مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے اندازہ کرر ہا ہو کہ میں اسکی مانگ پوری کرسکونگا یا نہیں......اور پھر وہ اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتا رہا۔جب اسکا ہاتھ باہر آیا تو میں حیرت واستعجاب میں ڈوب گیا۔

اسکے ہاتھ میں ایک سبز پاسپورٹ تھا۔

اُس نے پاسپورٹ کھولا اور ویزے کا صفحہ نکال کر میرے آگے کر دیا۔

''دوبئ''!۔اُس نے پہلی بار زبان ہلائی۔میں نے پاسپورٹ ہاتھ میں لے لیا۔اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔تصویر کی جگہ ایک نہایت نفیس شخص کی تصویر لگی تھی جو شاید اسکی دیوانگی سے قبل کی تصویر تھی۔

میں نے پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔اور اٹھ کر چلدیا۔

(۵۱)

ٹریٹ بلیڈ

’’**بھائیجان** کی نئی نئی داڑھی اگ آئی تھی اورانہیں شیو بنانے کا شوق چرایا۔
یوں بھی نو جوانی میں شیو بنا کر،ایک نو جوان ایک دم سے بچپن سے جوانی میں قدم رکھ لیتا ہے۔
اوراسے امید ہوتی ہے کہ لوگ اب اُسے بچہ جان کرنظر انداز کرنے کے بجائے سنجیدگی سے لیں گے۔
بھائیجان خوب چاؤ سے شیو بناتے،صابن سے جھاگ بناتے،ٹریٹ بلیڈکو سیفٹی ریز ر پر چڑھا کر پیچ کس دیتے۔یوں ریز ر تیار ہو جاتا۔
ٹریٹ مارکہ بلیڈ کافی اچھا مانا جاتا تھا۔کافی بکتا تھا۔
لیکن پھراس کمپنی کو کچھ اورزیادہ کمانے کی سوجھی۔
کمپنی نے ’’نیوٹریٹ بلیڈ‘‘ کے نام سےایک دوسرا اور رنگین کاغذ میں لپٹا بلیڈفروخت کیلئے پیش کیا۔
اشتہارکامتن تھا۔۔۔’’پہلے سے زیادہ کارآمداور بہترشیو کیلئے نیوٹریٹ بلیڈاستعمال کریں‘‘
ظاہرہےاس بلیڈ کی قیمت میں پندرہ پیسے کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔
بھائیجان جو پہلے ہی بہت بچابچا کر بلیڈاستعمال کرتے تھے۔نئے بلیڈ کے آنے سے پریشان ہو گئے۔اس کی قیمت زیادہ تھی۔۔۔اوران کے دوستوں نے فوراًہی بلیڈ بدل لیا تھا جبکہ وہ اب بھی پرانے بلیڈ پرگزارا کر رہے تھے۔
نئے بلیڈ کے مارکیٹ میں آنے سے وہ اپنے دوستوں سے دور ہو رہے تھے۔۔۔۔۔

(۵۲)

شاہین یا شاوٗ

طب کے میدان میں اعلی کارکردگی کے لیےنوبل انعام کی فہرست مرتب ہونے کے دوران ایک نام اچانک سے شامل ہوگیا۔اور پھرتو ہرطرف سے پذیرائی ہونے لگی۔۔۔۔ہوتے ہوتے جب فہرست مکمل ہوئی تو یہ نام سرفہرست تھا۔فہرست میں موجودتمام ناموں سے منفردمگر کرونائی وبا کے تناظر سے اہم،دنیا کی بڑی آبادی کی جان بچانے میں صف اول کا نام۔۔۔
اعلان سے چند گھنٹے قبل سیکریٹری اپنے کام کے مروجہ اصول پرعمل کرتے ہوئے فہرست کے پہلے تین نام ٹائپ کر کے پروفیسر کے کمرے میں پہنچ گئی۔وہ تینوں نام پڑھ کر پروفیسر کو سنا بھی دینا چاہتی تھی۔تاکہ اوّل غیرلاطینی زبان کے نام کا تلفظ بھی پروفیسر کو سمجھا سکے۔
مگر پروفیسر فون پرمصروف تھا۔وہ فہرست رکھ کر چلی آئی۔
نوبل کمیٹی کے سامنے پروفیسر نے صدارت کرتے ہوئے لفافہ کھولا اور پہلے ہی نام کو پڑھنے کی کوشش میں اٹک گیا۔۔۔جھنجھلا کر بولا مس ریٹا اب بھی ٹائپنگ میں غلطیاں کرتی ہے میرے خیال سے وہ مسٹر شاوٗ کو شاہین لکھ گئی ہے۔۔۔خیر دوسرے نمبر اور تیسرے نمبر کے نام آسان تھے۔۔۔سب ان دونوں ناموں پر متفق ہوگئے۔۔

(۵۳)

استاد شاگرد

"**بیٹا** تو کبھی میرا شاگرد نہیں رہا"۔
گرفتاری دیتے وقت بوڑھے پروفیسر نے ہٹے کٹے سے سپاہی کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور گویا ہوا۔
"اوُ بابا فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔تمہارے پاس یوں بھی وقت تھوڑا ہے۔کسی وکیل کو فون کرنا ہے تو بتاؤ۔اس سے پہلے کہ میرا ساتھی آجائے میں تمہارے لیے یہ کرسکتا ہوں کہ تمہارے وکیل کو تمہارے ہی موبائل فون سے میسج کر دوں شاید وہ تمہیں بچالے"۔۔۔
"نہیں"!بوڑھا تقریبا"چیختا ہوا بولا۔"تم میری وجہ سے اپنی نوکری کو خطرے میں مت ڈالو۔ اور پھر تم کس حوالے سے ایسا کروگے تم تو میرے شاگرد بھی نہیں تھے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو" نوجوان سپاہی بولا۔ "دراصل تم میرے باس کے استاد تھے۔اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ وہ تمہارا سامنا کرنے کی جراءت نہیں کرسکتا لہذا تمہیں اس کے سامنے پیش کرنے سے قبل ہی مار دیا جائے۔مجھے یہ بات جب میرے ساتھی نے بتائی تو میں نے تمہاری مدد کا سوچا۔"
اچانک سے اندھیرے میں دوسنسناتی گولیوں نے سپاہی اور پروفیسر کو ڈھیر کردیا۔
دوسرے دن کے اخبار میں خبر یہ چھپی: "فلسفے کے پروفیسر کا اپنے شاگرد کے ساتھ مشترکہ خودکشی کا اقدام"۔

(۵۴)

روگ

''تم آخرکس کاغم غلط کرنے کے لئے یہاں آتے ہو؟'' روجر کی آغوش میں لیٹی خوبصورت دوشیزہ نے اسکے بالوں کی لٹ سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

روجر دوشیزہ کے اس اچانک سوال پر بوکھلا گیا۔ وہ کافی عرصے سے اس کلب کا رکن تھا مگر آج تک کسی لڑکی نے اس سے ایسا سوال نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی کہانی سنانے کیلئے الفاظ جمع ہی کر رہا تھا کہ لڑکی پھر بولی۔

''کیا تمہیں میرے سوال سے تکلیف پہنچی ہے۔۔ مجھے معاف کردو۔''

''نہیں۔۔'' روجر سوچتے ہوئے بولا اور ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''آج سے پانچ سال قبل میں ایک ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا۔ میری شادی کو فقط ایک سال ہوا تھا ایک منحوس شام جب میں کام سے لوٹا تو مجھے معلوم ہوا کہ چند نامعلوم افراد میری بیوی کو اٹھا لے گئے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن میری بیوی مجھے نہ مل سکی۔ تب میں نے اپنے روگ کا علاج ڈھونڈ لیا۔'' اتنا کہہ کر روجر خاموش ہو گیا۔ لڑکی نے انتہائی کرب سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا! ''ہاں میں بھی تب صرف پانچ سال کی تھی جب عامر اور اسکے گروہ کے لوگ مجھے اٹھا کر لائے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور ماحول پر گہرا سکوت تھا۔

اور روجر آہستہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

❁❁❁

(۵۵)

گٹر کا ڈھکن

بھوک کے مارے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔دن بھر کے بعد وہ تھک ہار کر مایوسی میں اس فٹ پاتھ پر آبیٹھا تھا کہ نیند کے بہانے چند گھنٹے بھوک سے جان چھوٹے۔لیکن بھوک کی حالت میں تو نیند بھی بے رحم ہوگئی تھی۔پریشانی کے عالم میں اس نے کروٹ بدلی تو اسٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں چمکتا ہوا گٹر کا ڈھکن اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔چند لمحے وہ اسکو گھورتا رہا۔پھر اچانک ایک نئے خیال سے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔اسے لوہے کا یہ ڈھکن اس لمحے سونے کی اینٹ معلوم ہورہا تھا۔پھر وہ ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ڈھکن آرام سے کھل گیا۔قمیض اتار کر اس نے ڈھکن اس میں لپیٹا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد اسے ایک ہوٹل میں ملازمت مل گئی۔وہ میز صاف کرتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق کان منیجر کی آواز پر لگائے ہوئے تھا جو زور زور سے اخبار پڑھ رہا تھا۔اچانک ایک خبر نے اسکے حواس گم کر دیے۔

''گٹر میں گر کر بچی ہلاک ہوگئی۔''

وہ اس سے آگے نہ سن سکا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے تک وہ عجیب کج روی کا شکار رہا۔وقفے کی چھٹی ملتے ہی وہ کاؤنٹر پر گیا اور منیجر کی خوشامد کر کے اس نے اپنی پندرہ یوم کی تنخواہ پیشگی وصول کی اور باہر نکل کر بازار کی طرف چلدیا۔دوسری رات جب وہ اس گلی میں اسی گٹر کے قریب سے گزرا تو وہاں۔۔۔۔ڈھکن پہلے کی مانند اسٹریٹ لائٹ میں چمک رہا تھا۔

(۵٦)

ضرورت رشتہ

وہ آج بھی حسب معمول اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔اس وقت ہوٹل عام طور سے خالی ہوا کرتا تھااوراسی وجہ سے اسے ہمیشہ ایک مقررہ میز پر باآسانی جگہ مل جایا کرتی تھی۔
بیرے نے میز پر بسکٹ اور چائے کی پیالی رکھی اور چلا گیا۔یہ اس کا روز کا معمول تھا،جس سے ہوٹل کے بیرے بھی آشنا تھے۔اوراسے آڈر بک کرانے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی،۔پہلا ہی گھونٹ نہایت کڑوااور بدمزہ تھا۔
''ہونہہ۔۔'' وہ غصے سے پھنکارااور۔۔۔چائے کی پیالی زمین پردے ماری۔چھنا کے کی آوازسن کر بیرے اور منیجر دوڑتے ہوئے اسکے پاس آئے۔
''کیا ہوگیا۔۔؟''منیجر نے سخت لہجے میں پوچھا۔
''انتہائی بدمزہ چائے۔۔'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔
''بدمزہ چائے'' منیجر نے اس کا جملہ دہرایا۔ ''یہاں تو ایسی ہی چائے ملے گی۔پھر یہ کون سا طریقہ ہے شکایت کا۔آپ نے پیالی توڑی ہے آپ کو چائے کے علاوہ پیالی کے پیسے بھی دینے ہوں گے یہ ہوٹل ہے آپ کا گھر نہیں۔'' منیجر بڑبڑاتا رہا۔
بیرے جلدی جلدی صفائی میں لگ گئے۔اس نے خاموشی سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر طشتری میں رکھااور چھوٹے قدموں سے گھر چلا آیا۔بستر پر لیٹے ہوئے منیجر کا جملہ اس کے

کانوں میں گونجتا رہا۔
''یہ ہوٹل ہے آپ کا گھر نہیں۔''اور بار بار یہی جملہ صدائے بازگشت بننے لگا۔
شام کے وقت وہ ایک مقامی اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار بک کروا رہا تھا۔

(۵۷)

فٹ پاتھ

''اے۔۔۔اٹھو! یہاں کیوں سوئے ہوئے ہو''۔ پولیس والے نے اسکے پاؤں پر ڈنڈے سے چوٹ لگائی تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ گیا۔
''تمہیں معلوم ہے کہ فٹ پاتھ پر سونا خلافِ قانون ہے۔''پولیس والا بولا۔
''پھر کہاں سوؤں؟''اس نے عجیب نظروں سے پولیس والے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''گھر میں اپنے''۔پولیس والے نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔
''گھر۔۔!'' اس نے زیرلب دہرایا اور صبح کا منظر اسکی نگاہوں میں پھر گیا جب کرایہ ادا نہ ہونے کی وجہ سے مالکِ مکان نے اسکا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔وہ لاکھ منتیں کرتا رہا کہ ہفتواری ملتے ہی ادا کر دونگا مگر مالکِ مکان نہ مانا۔اسکے پاس اتنے ہی پیسے تھے کہ چند وقت

کھانا کھا سکتا بھلا ہوٹل میں کہاں ٹھہرتا۔

''کیا سوچنے لگے''۔ پولیس والے کی آواز پر وہ چونکا۔''گھر نہیں ہے تو لاؤ دوروپے نکالو ۔۔۔ورنہ بھاگ جاؤ یہاں سے۔''

ایک لمحے کی کشمکش کے بعد نیند کا لطف غالب آ گیا اور اس نے جیب سے دوروپے نکال کر پولیس والے کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔اور پھر ٹانگیں پسار کر نیند کی وادی میں دوبارہ کھو گیا۔اسکے چہرے پہ گہرا سکون اور طمانیت چھا گئی۔۔۔۔۔۔۔۔

❁❁❁

(۵۸)

تسکین

سارا گاؤں سبزی خور اور بس وہی دونوں میاں بیوی گوشت خریدتے۔ایسے بھلا کب تک چلتا۔قصائی ایک دن دوکان بند کر کے شہر چلا گیا۔

اب اسکے شوہر کو گاؤں سے شہر جانا پڑتا۔کیا کرتا اسکی بیوی گوشت کی بڑی شوقین تھی۔پھر جب اسکے شوہر کو اپنے کام کے سلسلے میں کسی دوسرے ملک جانا پڑ گیا تو گوشت لانے کی ذمہ داری خود اسکی بیوی پر آ پڑی۔

گاؤں سے نکل کر جنگل سے ہوتے ہوئے وہ شہر جاتی اور گوشت خرید کر لے آتی۔ یوں بھی شوہر قریب نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس وقت ہی وقت ہوتا۔ اور وہ اسی بہانے وقت گزاری بھی کر لیتی۔

جنگل سے گزرتے اس کی نگاہ جنگلی جانوروں پر بھی پڑتی۔کبھی وہ دیکھتی کہ کوئی خونخوار درندہ اپنے

شکار سے لطف اندوز ہو رہا اور اس کی تکا بوٹی کر کے شکار کو ہڑپ کر رہا ہے۔
اس کو یہ منظر بہت دلچسپ لگتا۔ایسا لگتا کہ اس کے گوشت کھانے کی خواہش اور لذت ایسے کسی منظر سے ہی پوری ہو جا رہی ہے۔
پھر اس کو ایک خیال سوجھا۔اس نے شہر جانا ترک کر دیا۔وہ جنگل میں ہی کچھ شکار کر کے اپنی تسکین کر لیتی۔اور کبھی کوئی جنگلی جانور اس کی مدد کر دیتا۔

(۵۹)

ہل اسٹیشن پر مچا کہرام

وہ اس رات ہوٹل کی تلاش میں کئی ایک ہوٹل کے استقبالیہ پر گیا۔اور ہر دفعہ اسے مایوسی ہوئی۔اس سرد رات میں برفباری دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی اور درجہ حرارت کا پارا اپنی شرارت میں نقطہء انجماد سے نیچے اتر گیا تھا۔تیز ہوائیں ماحول کو اور زیادہ خوابناک سے خوفناک تر بنا رہی تھیں۔
اس سیزن میں ہل اسٹیشن پر سیاحوں کی آمد یکدم بڑھ گئی تھی۔برفباری کی اطلاع ملتے ہی دور دراز کے سیاح میدانی اور ریگستانی علاقے سے آ کر اس دامن کوہ میں کچھ وقت کے لیے سیر و تفریح کرتے تھے۔
سیاحوں کی یکدم آمد سے ہوٹل مالکان کے دل میں لالچ اور طمع کے بیج سے حرص کی کونپلیں پھوٹ پڑیں تھیں اور وہ منہ مانگے دام وصول کرنے لگے۔

ان کا خیال تھا کہ دور دراز سے آئے سیاح ضرور ہوٹل کے کمرے بک کروائیں گے اور ان کی من مانی سے مالکان خوب کمائیں گے۔سال بھر کے بعد یہی تو موقع تھا کمانے کے بہانے لوٹنے کا۔

بیشتر سیاحوں کو واپس بھیج کر ہوٹل مالکان مزید اچھے سے اچھے گاہک کے منتظر ہی رہ گئے۔
سردی میں ٹھٹھرتے اپنی اپنی کاروں میں، ہوٹل کی تلاش میں بھٹکتے سیاح رات اپنی کار میں ہی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بیشتر سیاح کسی موسم گرما میں ہجرت کرتے پرندوں کی طرح نامعلوم مقام کی طرف پرواز کر چکے تھے۔اس سیزن میں ہل اسٹیشن پر کہرام مچا تھا۔ہوٹل مالکان اور سیاحوں کے لواحقین دونوں کا بڑا نقصان ہوا تھا۔۔۔

❁ ❁ ❁

(٦٠)

پچاسویں سالگرہ

سارے ملک میں پچاسویں سالگرہ کی تیاری جاری تھی۔سرکاری تقریبات جلسے اور جلوسوں کی تیاری۔۔۔۔بس ایک دن ہی باقی تھا۔ایسے میں جیل میں بھی جشن آزادی کی پچاسویں سالگرہ منانے کی تیاری جاری تھی۔

''سر!'' سپرنٹنڈنٹ کے سامنے فائل رکھتے ہوئے قاصد بولا۔

''سر اس قیدی کے پھانسی کے حکم پر دستخط فرما دیں۔''

''ہوں! '' سپرنٹنڈنٹ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا نمبر کیا ہے؟''

''سر پچاس!'' قاصد بولا۔

''اُف تو پھر تو تمہیں پتہ ہے اس کو سزا اسی دن ہوگی نا۔۔!''

''یس سر سارے انتظام ہو چکے ہیں''۔

اور اشارہ پا کر قاصد دروازے سے نکل گیا!!!

❁ ❁ ❁

(۲۱)

راعمسس دوم

میوزیم میں ایک دم سے شور مچ گیا۔

بھگدڑ مچ گئی۔لوگ باگ بھاگے جا رہے تھے۔

اور میوزیم خالی ہو چکا تھا۔

ایک سکیورٹی گارڈ کو روک کر میں نے پوچھا''کیا ہوا''؟

''وہ۔۔۔وہ ہانپتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔راعمسس دوم اپنے تابوت سے باہر نکل آیا ہے''۔

''وہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔''

کہہ کر گارڈ بھاگ گیا۔

میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے۔۔۔راعمسس کے تابوت کے قریب پہنچ گیا۔

وہاں تو عجیب ہی منظر تھا۔
رائمسس حنوط شدہ بیٹھا بہت بھیانک لگ رہا تھا۔
سب لوگ اس کے آگے جھکے ہوئے تھےاوراسے سجدہ بجالا رہے تھے۔
اردگرد خاصہ مجمع لگا ہوا تھا۔
ادھرِ ادھر سے مجھے پتہ چلا کہ وہ، وادیءِ سندھ کے والی اپنے دربار میں بلانے پر مُصر ہے۔
رائمسس دوم کے لیے وقت تھم گیا تھا،اتنے سالوں کا جو اس کے جانے کے بعد گزر چکے تھے،کا
اسے کوئی ادراک نہ تھا،وہ آج کے دور کو اپنا دورِ حکومت سمجھ رہا تھا۔
اور سوچ رہا تھا کہ وادیءِ سندھ کے والی سے خراج وصول کریگا۔
اسے اپنی ترقی۔۔۔پر ناز تھا۔
اوراپنی طاقت پر گھمنڈ۔
خراج نہ ملنے کی صورت میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔
جب اسے بتایا گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔
اور وادی میں ایک آصف جاہ نامی آدمی کی حکومت ہےاور
وہاں کے لوگوں نے اُسے منتخب کیا ہے تو یہ سب سن کر وہ آگ بگولہ ہونے لگا۔
لوگ۔۔۔عوام۔۔۔انہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا سربراہ چن لیں۔
کیا وہ سب لوگ اس آدمی کے دستِ نگر نہیں۔
کیا وادی نے اپنا خراج بھیجا ہے؟
رائمسس دوم کے سوالوں کا جواب ہجوم کے پاس نہ تھا۔

(۶۲)

جھولا

''**دیکھو** بھائی۔۔۔۔۔پیسے نہیں! اگر تمہارے پاس گاڑی ہے اور تم چند گھنٹے روزانہ یا ہفتے میں ایک بار یا ماہانہ ہی سہی اپنی گاڑی زخمیوں کو اسپتال لے جانے کے لیے استعمال کر سکو تو یہی بڑی بات ہے۔''

ستار صاحب فون پر کسی کو کہہ رہے تھے۔۔۔فون پر اجنبی خاموش ہو گیا شاید سوچ میں پڑ گیا۔۔۔''زیادہ مت سوچو'' وہ پھر بولے۔''اپنا فون نمبر لکھواؤ اور یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس وقت کب ہوتا ہے۔۔۔۔اگر کبھی تمہارے پاس کوئی فون آئے اور تمہارے لیے ممکن ہو تو بس فوراً نکل۔۔۔۔پڑنا۔۔۔۔ٹھیک ہے

بھائی۔۔۔'' وہ بولتے رہے اور فون کرنے والا قائل ہو گیا۔۔۔۔

بلقیس میں باہر جا رہا ہوں کہہ کر وہ چلے گئے۔جب وہ لوٹے تو ایک بڑے سے پالنے کو اٹھائے ہوئے تھے۔ان کی مدد کو دو لوگ ان کے ساتھ تھے۔

''یہ ٹھیک جگہ ہے،اسے دروازے کے باہر یہاں لگا دو۔'' انہوں نے پالنا رکھوا دیا۔

جب دونوں مددگار چلے گئے تو بلقیس جو سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔۔۔

بولیں''۔۔۔ستار یہ پالنا۔۔۔اور وہ بھی گھر کے سامنے۔یہ کیا ہے؟''

''نیک بخت اس پالنے کو کوکھ کہو،اور ہم تم ملکر یہ منادی کراتے ہیں کہ آج کے بعد کوئی بھی اپنے نومولود بچے کو کوڑے کے ڈھیر یا نالی میں پھینکنے کی بجائے خاموشی سے یہاں ڈال جایا کرے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''،بلقیس قائل ہو گئیں۔

عرصے بعد جرمنی میں۔۔۔۔

ایک سماجی تنظیم کی ایماپہ حکومت نے ایسی ہی ایک اسکیم پیش کی۔۔۔۔''بے بی کلاپے''اس کونام دیا گیا۔۔۔۔۔ ہر نئے کھلنے والے پھول کو دیکھ بھال اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔

❁ ❁ ❁

(۶۳)

کرامت

سارے دوا دارو کے باوجود اس کی گود ہری نہ ہوئی۔

نصیبو کا میاں بارہ سال سے بیوی سے نرینہ اولاد کا مطالبہ کررہا تھا مگر نصیبو نرینہ تو کیا کسی لڑکی کو بھی جنم نہ دے سکی تھی۔اس کے میاں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ شاید خرابی خود اس میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر کلو یہ کب سوچتا۔۔۔۔اور سوچتا تو جب اس کے پاس دماغ ہوتا۔اس کی عقل تو جسم کی طرح بس موٹی تھی۔

نصیبو کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا اور پھر باہر چلا جاتا۔

نصیبو کی ماں تمام حالات سے تنگ آ کر ایک دن اسے لیکر گاؤں کے ایک پہنچے ہوئے پیر صاحب کے پاس پہنچ گئی۔

پیر صاحب نے نصیبو پر پڑھ کر پھونکا،اسے تعویذ دی اور پھر ایک پھکی بھی دی۔

جب اگلی دفعہ آنا تو اسے منہ میں ڈال لینا۔

نصیبو نے ماں کی ہدایت کے مطابق میاں کو ہوا بھی نہ لگنے دی کہ وہ علاج کروا رہی ہے۔

اگلی دفعہ ماں بیمار تھی اس نے نصیبو کو پیر صاحب کے پاس اکیلے بھیج دیا۔
پیر صاحب اسے بار بار بلاتے۔
ہر دفعہ جب نصیبو پیر صاحب کے آستانے جانے کے لیے نکلتی دوامنہ میں رکھ لیتی۔
راستہ لمبا تھا۔۔۔۔۔۔وہ تھک جاتی۔
اور آستانے تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے کیوں وہ بالکل خوابیدہ سی ہو جاتی۔
پیر صاحب کا ڈیرہ بالکل خالی ہوتا وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔۔۔۔
اندر کمرے میں لے جاتے اور علاج شروع ہو جاتا۔
صرف تین ماہ میں ہی پیر صاحب کے علاج نے رنگ دکھایا۔
نصیبو امید سے ہوگئی۔
وہ اپنی قسمت پر رشک کرنے لگی۔
اس نے پھر بھی کھل کر نہ دیا کہ یہ کرامت پیر صاحب کی ہے۔
گاؤں کی خواتین میں پیر صاحب کی کرامت کا شہرہ تھا۔دور دور سے خواتین مراد مانگنے آتیں اور من کی پاتیں۔
اس گاؤں کے مختلف گھرانوں میں آس پاس کے گاؤں کے
لوگ حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے۔

(۶۴)

بیہودہ کتا

''**حضورِ والا** اس شخص کے پالتو کتے نے میری موکلہ کو جنسی طور پر ہراساں کیا ہے۔اور اس لیے اس کتے کے مالک کو ضرور دی جانی چاہیے۔اگر اس کتے کا مالک اپنے کتے کی صحیح تربیت کرتا اور اپنے کتے کو ایسی حرکت کرنے سے روکتا تو میری موکلہ کو یوں تکلیف نہ پہنچتی۔''

حضورِ والا۔۔۔عدالت میں مقدمہ دائر کرنے والی خاتون کا وکیل مسلسل بول رہا تھا۔۔۔کچھ توقف کے بعد وہ پھر سے بولنا شروع ہو گیا۔

''ملزم کا کتا میری موکلہ کی جانب منہ کر کے ایسی حالت میں تھا۔۔۔۔جو جنسی فعل کی ادائیگی ظاہر کرتی ہے۔نیز اس کا عضوِ تناسل مکمل طور پر۔۔۔۔۔

اس طرح سے یہ کتا میری موکلہ پر جنسی حملہ کرنے کی شر انگیز کوشش کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔

دلائل چلتے رہے۔جوابی دلائل سامنے آتے رہے۔

تمام دلائل سن کر عدالت نے کارروائی اگلی پیشی تک معطل کر کے اگلے ہفتے کی تاریخ دے دی۔

ایک ہفتے کے بعد فیصلہ سنانے کے دن سب لوگ جمع ہوئے۔

جج نے کارروائی کا باقاعدگی سے آغاز کیا اور کہا۔

''ملزم کتے کو کٹہرے میں پیش کیا جائے''

حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور پھر جج نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔کتے کو سزا سنا کر جیل بھیج دیا۔

❁ ❁ ❁

(۶۵)

ہاراہواملاح

وہ کاغذ قلم سنبھال کہانی لکھنے بیٹھااوراپنی کہانی کوایک خاص سمت میں لے جانا چاہتا تھالیکن اس کی کہانی بضد تھی کہ وہ کہانی انجام پر لے جائے جواس کہانی کی منشا ہے۔لکھاری اور کہانی کے مابین مکالمے چل رہے تھے،لکھاری ایک مستعد ملاح کی طرح کشتی کو کھیتے ہوئے اسے منجدھار سے نکالنا اپنا فرض سمجھتا تھااور کوشاں تھا کہ کشتی کو پرسکوت کھلے سمندر میں لے آئے اور منزل کی جانب گامزن ہوجائے۔

مگر کہانی اصرار کررہی تھی وہ جان چکی تھی کہ طوفان میں پھنسی اِس کشتی کا مقدرِشکست وریخت ہے،ٹوٹ پھوٹ ہےاس بدقسمت کشتی کو پاش پاش ہونے سے کوئی نہیں بچاسکتا،وہ لکھاری کی مصلحت کوشی پر شرمندہ بھی تھی اور برافروختہ بھی تھی۔

اسی رسہ کشی میں لکھاری نے کہانی لکھنا شروع کیا۔

انسانوں کا ایک ہجوم ہے ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے انسانوں کا زور زور سے بولنے کی آواز سے برہم ہجوم میں شامل افراد کی ہلچل اورآگے پیچھے ہٹنے بڑھنے کی حرکات دکھائی دے رہی ہیں آگے پیچھے ہٹنے بڑھنے کے باوجود مجمع۔۔۔۔ہجوم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہورہا تھا۔

زندہ لوگوں کا ہجوم جواپنے کاندھوں پہ ایک مردہ لاش اٹھائے اپنے تیئں کسی سمت رواں دواں بھی تھے،مگران کی منزل کوئی نہیں تھی،ہجوم ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا تھا،ہجوم میں بیچوں بیچ بہت سارے بونے اچھل کود کررہے تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔وہ تو بس اچھل کود کر،اوروں کے قدموں تلے کچلے جانے سے بچنے کی کوشش کررہے تھے۔ہجوم اب تک

جوں کا توں کھڑا تھا۔آ گے بڑھنا تو دُور کی بات تھی مجمعے کا پیچھے ہٹنے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ایسا کچھ ہجوم میں سے کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

پھیلتی تیرگی میں سمندر کے کنارے کھڑا ملاح اپنی ٹوٹی کشتی کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ اپنی کشتی کو سمندر کی بے رحم لہروں سے نہیں بچا پایا تھا۔۔۔۔اس کی کشتی سمندر کے کنارے سر اٹھائے سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی تھی۔کہانی دُور کھڑی ہیجانی قہقہے لگا رہی تھی۔۔۔۔تاریکی اپنا دامن مزید پھیلا رہی تھی۔۔۔۔اور لکھاری کی آخری امید۔۔۔۔سورج کی آخری کرنیں بھی ڈوب چکی تھیں۔۔۔۔اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔

❁ ❁ ❁

(۲۶)

بل فائیٹنگ

رِنگ ماسٹر اچھل کر بھینسے پر سوار ہو گیا اور بھینسے نے اچھل کود شروع کر دی۔ایک جھٹکے سے باڑ کا گیٹ کھلا اور بھینس نے ایک ہی ہلے میں سوار کو پیٹھ پر سے اتار پھینکا۔

اب اس بھر بھری مٹی کے گداز سے رِنگ میں ماسٹر اور بھینسے کی موت وزندگی کا فیصلہ ہونا تھا۔

ماسٹر نے زمین سے اٹھتے ہوئے مجمعے پر نظر ڈالی۔بچے بوڑھے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

ایک ادا سے گھومتے ہوئے اس نے اپنی قبا اتاری اور تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔

کچھ دور کے فاصلے پر بھینسے نے اپنے قدم جمائے اور اتنی تیزی کے ساتھ ماسٹر کی طرف لپکا کہ ماسٹر اگر اچھل کر پرے نہ ہو جاتا تو بھینسا اُس کا کچومر ہی نکال دیتا۔

بھینسے کے وار کو جھکائی دینے کے بعد نوجوان بہت ہی محتاط ہو گیا تھا۔جتنی دیر بھینسے کو تیزی سے آگے نکل کر اور پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے میں لگتی،اس کے پاس بس اب اتنا ہی وقت رہ گیا تھا۔

قبا کو الٹا کر کے اس نے دونوں ہاتھوں سے جھٹکا دیا اور ہوا میں لہراتے ہوئے وہ تیار ہو گیا۔

بھینسے نے جب پھر دوڑنے کی پوزیشن لی تو ماسٹر دوسری جانب سرخ رنگ کا کپڑا پھیلائے اس کا منتظر تھا۔

پھر وہی ہوا۔۔۔بھینسا مارا گیا اور اُس کو بھوننے کی تیاری شروع ہو گئی۔

ہر دفعہ یہ کھیل ہوتا ہے اور لڑائی میں بھینسا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔لیکن جنگ ہارنے سے قبل اس کی آنکھوں کی نمی اپنے آباواجداد میں سے اس بزدل کی یاد میں ہوتی ہے جس نے جنگ کی مشکلات سے بچنے اور مرنے کے خوف سے عین لڑائی میں اپنی جان کے عوض ایک راز فاش کر دیا تھا۔

اسی لیے ماسٹر ہمیشہ سرخ کپڑے کی سہولت سے یہ جنگ جیت لیا کرتا ہے۔

(٦٧)

مفاد کا ٹکراؤ

''وزیر اعظم کے انتخاب پر خزانے کا منہ کھول دو''۔

بادشاہ نے اپنے وزیر باتدبیر کو حکم دیا۔۔۔۔۔

''مگر حضور والا۔۔۔۔اس غریب ملک میں ہماری کیا دلچسپی ہے۔وہاں کی ہر حکومت ہمارے مفاد کی پاسداری تو ویسے ہی کریگی۔۔۔''وزیر بولا

''دیکھو! ہمارا لگایا ہوا پیسہ انہیں امیر نہیں بلکہ غریب بنانے کے لیے ہے۔''

باشاہ نے وزیر کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کو کہا۔۔۔۔۔

''سر آپ کی کامیابی کی ضمانت بادشاہ سلامت نے لے لی ہے۔انہوں نے جو پیسہ لگایا ہے اس کے بدلے میں آپ کی حکومت، وقت آنے پر بادشاہ سلامت کی من پسند تنظیموں کی سہولت کار بننے کی پابند ہوگی۔''

''یہ تنظیمیں پہلے مرحلے میں دھونس دھمکی سے دوسری تمام سیاسی جماعتوں کو انتخابات سے پہلے جلسے جلوس میں حصہ لینے سے عملی طور پر روک دیں گی۔میدان آپ کے لیے صاف ہوگا۔بادشاہ کا خاص ایلچی بولتا رہا۔۔''

کچھ عرصے بعد۔۔

''سر ہم پہ دھاندلی کا الزام لگایا جا رہا ہے۔''

ایک کارندہ بولا۔۔۔

''وہ کیوں۔۔''وزیراعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔
''ہم نے کون سے ان کے ووٹ چرائے ہیں۔۔۔۔ہم نے تو ووٹر چرالیے ہیں۔۔۔'' وہ ڈر گئے گھر سے باہر ہی نہیں نکلے۔۔
تھوڑے دنوں بعد وزیراعظم ہاوس کے سامنے کھڑا شخص مُصر تھا۔
''مجھے وزیراعظم سے ملنا ہے۔۔''
''وہ تو باہر نکل چکے ہیں''دفتری بولا۔
''اپنے وزیراعظم سے کہو کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔۔۔۔''اس آدمی نے جو کہ پیغام لایا تھا زور سے بولا۔۔۔۔۔
''مم۔۔مم وہ سپہ سالار ان کے قابو میں نہیں۔''
''بادشاہ سلامت سے کہو کہ وہ کچھ کریں۔۔۔۔۔ورنہ ہم۔۔۔سب''
۔۔۔۔''ہم سب نہیں صرف تم اور تمہاری ٹولی۔۔۔'' آنیوالے نے دفتری کی بات کاٹی۔۔
''جاؤ در بدر۔۔۔پھرو
اچھے وقت کا انتظار کرو''
اتنا کہہ کر وہ شخص اندھیرے میں گم ہوگیا۔۔۔۔

(۶۸)

اسکول کا بستہ

''ہاتھ پھیلاؤ۔۔'' ماسٹر نے پوری جماعت کو پہلے کھڑے ہونے کو کہا۔ اور پھر سب سے آخری بینچ کے آخری سرے پر بیٹھنے والے لڑکے کے پاس جا کر زور سے کہا۔

'' ہاتھ پھیلاؤ۔۔'' وہ پھر سے چیخا۔

کلاس کے سب سے آخری کونے میں بیٹھنے والا یہ لڑکا پہلے ہی جبراً اسکول آتا تھا۔ وہ کبھی بھی خوشی خوشی اسکول نہ آیا تھا۔ وہ آخری بینچ کے آخری سرے پر جماعت سے باہر نکلنے کے پچھلے دروازے کے قریب بیٹھتا تھا۔

ماسٹر کا موڈ آج بہت خراب تھا۔ وہ بلاتفریق سب کے پاس جاتا اور ہر طالب علم کو اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر دو اور دو اُلٹے ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنی چھڑی سے اس زور سے چوٹیں لگاتا کہ لڑکے دوہرے ہو جاتے۔ کوئی اپنا ہاتھ سہلا کر ہی رہ جاتا اور کوئی نہایت زور سے چیخ کر ماسٹر کو مزید غصہ دلاتا اور اس چیخ کے بعد ماسٹر کی کوشش ہوتی کہ چھڑی پھیلے ہوئے ہاتھ سے مزید زور سے ٹکرائے۔

آخری۔۔آخری سے پہلی اور یوں جب ماسٹر میرے پیچھے کی تیسری رو تک سب کو بلاتمیز قصور و بے قصور دو سیدھے ہاتھ پر اور دو الٹے ہاتھ پر لگاتا پہنچ گیا تو میرے سامنے چھڑی کی مار اور اس کی ہولناکی دن میں تاروں کی مانند ناچنے لگی۔ یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ آج سوال گھر سے کام کر کے لے آنے یا نہ آنے کا نہیں، بلکہ آج ماسٹر کی ہوس زادشت کا سوال ہے۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔اپنا بستہ اٹھایا اور سامنے والے دروازے سے جو کہ میری بینچ سے بالکل قریب ہی تھا کلاس سے نکل بھاگا۔

(٦٩)

نیلو

شاید میں غلطی کر رہی بیٹھتا مگر میری نگاہ اپنی ٹوٹی ہوئی چپل اور میلے کچیلے کپڑوں پر پڑ گئی اور میں پلٹ کر اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہائیں۔۔۔سہیل! تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔تم نیلو کو نہیں پہچانتے۔''

نیلو ایک رئیس خاندان کی فرد تھی میں اس کے سامنے سہیل کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔
بوسیدہ گلیوں کے بوسیدہ مکانات کے درمیان میں رہنے والے خستہ حال سہیل کو دیکھ کر وہ جانے کیا سوچتی؟

میں نے آہستہ سے کہا۔

''آپکو غلط فہمی ہوئی ہے محترمہ۔۔'' اتنا کہہ کر میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دوسرے دن لائبریری میں میں نے نیلو کو دیکھ کر بڑی سادگی سے پوچھا۔

''کیا حال ہے نیلو؟'' لیکن اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔میں گھوم کر اسکے سامنے آ گیا۔

''کیا ناراض ہو؟''میں نے پھر پوچھا۔

''میری نگاہیں تمہیں ہزار شبیہ میں پہچان سکتی ہیں۔''نیلو ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''اگر تم غریب ہو تو یہ کونسا جرم ہے۔اور تم آخر کب تک امارت کے بوسیدہ پردے میں خود کو فریب دیتے رہو گے۔جاؤ آج سے ہماری دوستی ختم۔میں باحوصلہ لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔۔''

اتنا کہہ کر وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

(۷۰)

حلال

مولوی کی غراتی ہوئی آواز کا شور سن کر فضائی کمپنی کا ایک ملازم تیزی سے اس کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''یا حضرت ہم ہیں نا۔۔آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''اور مولوی کے پاؤں میں پڑے اٹیچی کیس کو اٹھائے ایک خالی کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے اپنا کمپیوٹر کھولا اور جلدی جلدی مولوی اور اس کی سر تا پاؤں ملفوف بیگم کا بورڈنگ کارڈ بنانے لگا۔

میں بھنا کر رہ گیا۔۔۔اپنی باری آنے پر مجھے فارغ کرنے والے سے میں نے جل کر کہا:

''کیا یہ مولوی قطار میں کھڑا ہم سب کی طرح انتظار نہیں کر سکتا۔''

کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے ادھر ادھر دیکھا اور جب اسے یقین ہو چکا کہ مولوی فارغ ہو کر آگے بڑھ چکا ہے تو آہستہ سے بولا۔۔۔میاں کہاں ان چکروں میں پڑ رہے ہو۔ہنگامہ بڑھ گیا تو

فلائٹ بھی کینسل ہوسکتی ہے۔بس اسی لیے کمپنی کا حکم ہے کہ ہم ایسے مولوی حضرات سے جان چھڑانے کے لیے انہیں فوری طور پر فارغ کر دیں۔

جانتے ہووہ کیا کہہ رہا تھا۔۔۔

ہاں میں بولا۔۔۔

یہی کہ قطار لگا کر کھڑے ہونا۔۔۔۔کسی انسان تک پہنچنے کے لیے۔۔۔حرام ہے۔

ہاں اور جو تم نے نہیں سنا وہ بھی سن لو۔۔۔وہ شخص بولا، وہ کہہ رہا تھا کہ قطار کا لگانا صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔جن میں سے ایک جہاد ہے۔۔۔۔

ایسے فتوی کے سامنے تم کیا کرتے۔۔۔۔جملہ ختم کرتے ہوئے فضائی کمپنی کے ملازم نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔۔۔میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنا کارڈ پکڑا اور چل پڑا۔

❁ ❁ ❁

(۷۱)

حلال گوشت

''اچھا تو تم اور کیا کرتے ہو اپنے فارغ وقت میں۔''

وکیلِ سرکار ملزم کو باتوں میں لگائے رکھ کر مزید باتیں اگلوانا چاہتا تھا۔

''جی جناب وہ۔۔وہ ایسا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں میں رہتا ہوں وہاں حلال گوشت نہیں ملتا اور اس لیے مجھے گوشت لانے قریبی شہر جانا پڑتا ہے۔''

''اچھا تو تم مسلمان ہو اور صرف حلال گوشت کھاتے۔۔۔''

''جی جی'' وہ ہکلایا۔''اچھا یہ بتاؤ کہ تم صرف گوشت حلال کھاتے ہو یا۔۔۔میرا مطلب ہے''
وکیلِ سرکار نے اپنے لفظ کو چباچبا کر ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''صرف گوشت ہی حلال کھاتے ہو اور باقی۔۔۔چیزیں بھی۔''
''جی وہ جی۔۔۔'' ملزم نے گڑبڑاتے ہوئے کہا ''سر میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''
''بھئی سیدھی سی بات ہے۔تم کو میں نے گرفتار کیا ہے، تم رنگے ہاتھوں پکڑے بھی گئے ہو اور تم جرم سے انکار بھی نہیں کر رہے۔تو تم نے جو اس کم سن لڑکے کے ساتھ جنسی زیادتی کی ہے تو کیا یہ گوشت تمہیں حلال لگا تھا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وکیلِ سرکار نے جج کی طرف دیکھا۔
جج نے ملزم کو لے جانے کا اشارہ کیا۔

(۷۲)

نیا ٹیسٹ

اس دن جب شہر بھر میں ہونے والے تمام کورونا ٹیسٹ کے رپورٹ میں ایک بھی شخص مثبت نہیں نکلا تو شہری محکمہ صحت کے سربراہ کو سخت غصہ آ گیا اس نے ماتحت کو بلا کر خوب جھاڑ پلائی اور اسے معطل کرنے کی دھمکی دے کر درست طریقے سے چھان بین کر کے نئی رپورٹ تیار کروانے کے لیے کمرے سے باہر بھیج دیا۔
پھر اس نے گورنر کے پی اے سے بات کی کہ اس سلسلے میں وہ گورنر سے بات چیت کرنا چاہتا

ہے۔

گورنر کے پی اے کومعلوم تھا کہ کیا ہورہا ہے۔اس نے گورنر کی ہدایت کے مطابق مرکز کے وزارت داخلہ کورپورٹ بھیج دی کہ آج تمام شہراورصوبے سے بس ایک ہی خبرموصول ہورہی ہے۔ایک بھی کوروناٹمیسٹ پازیٹونہیں۔تمام کےتمام افرادنیگیٹو ہیں۔

تمام رپورٹ جمع ہوکروزیراعظم تک پہنچ گئی وزیرصحت،وزیراعظم اورملک کے ماہراعلی مشیرڈاکٹر سب جمع ہوئے اورگرما گرم بحث چل رہی تھی۔

پھروزیرصحت نےمشیرڈاکٹرکوقائل کرلیااوریوں ملک کوایک بڑے مشکل مرحلے سے بچالیا گیا۔ ایک اعلامیہ کےتحت کوروناوائرس کی موجودگی کاپتہ چلانے والامروجہ ٹیسٹ درست نہیں تھا۔۔۔دوسرے دن سے کورونا کاپتہ چلانے کے لیےایک نئےٹیسٹ کومتعارف کرادیا گیا۔

(۷۳)

پابندی

سارے شہرمیں ہفتہ ٹریفک منایاجارہاتھا۔جگہ جگہ پوسٹرنصب تھے۔
کہیں 'سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پرچلیں' کابورڈلگاتھا
توکہیں 'ٹریفک اورسگنل کی پابندی کریں' کی عبارت درج تھی۔

میں نمائش پر کھڑا بس کا انتظار کرر ہا تھا۔سامنے پولیس کی چوکی تھی جس کے احاطے میں بھی ہفتہ ٹریفک کے سلسلے میں ایک بورڈ لگا تھا۔

سپاہی کے اشارے پر تمام گاڑیاں رک گئیں لیکن ایک نوجوان موٹر سائیکل سوار نے جو بہت ہی تیزی سے آ رہا تھا۔سپاہی کی پرواہ کیے بغیر نکلنا چاہا۔۔مگر وہ گلی سے نکلتے ہوئے ٹرک کو نہ دیکھ سکا۔اور سڑک پار کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ ٹرک کا ہارن پورے زور سے گونجا۔۔لیکن دیر ہو چکی تھی۔موٹر سائیکل سوار ٹرک کے ایک ہی ٹکر میں مع موٹر سائیکل کے اچھل پڑا۔

نوجوان تو وہیں پر ہی گر گیا مگر موٹر سائیکل سامنے لگے بورڈ کو توڑتی ہوئی چوکی کے احاطے میں جا گری۔

’ٹریفک سگنل کی پابندی کریں‘لکھی عبارت کا بورڈ زمین بوس ہو چکا تھا۔۔۔

(۷۴)

نصاب

’’وزارتِ داخلہ کا قلمدان ہے اس کے پاس؟ مدرسے میں داخلے کے معاملات سنبھالتا ہے کیا؟‘‘ کھانا کھانے کے بعد لمبی سی ڈکار مارتے ہوئے مولوی صاحب نے سوال کیا۔

عموماً ایسا نہیں ہوتا۔مگر آجکل یہی کام آ پڑا ہے سو وہی کرر ہا ہے۔

کہلاتا وزیرِ داخلہ ہی ہے'' آدمی بولا

''اچھا تو پھر اس کا حصہ وغیرہ جا رہا ہے نا؟'' مولوی صاحب نے پھر سوال کیا

''جی وہ تو ہے۔لل۔۔۔۔لیکن ایک مشکل ہے'' آدمی ڈرتے ڈرتے بولا۔

''یہ نیا وزیرِ داخلہ کہتا ہے کہ نصاب میں طبیعات اور کیمیا پڑھاؤ''

''ارے ارے''۔۔۔مولوی صاحب نے بولنا شروع کیا۔

''ارے بھائی وہ بہت لائق فائق انسان ہے وہ بہت درست کہہ رہا ہے کیمیا گری کا ہی تو سارا چکر ہے۔طبیعات اور۔۔۔۔۔۔ہمارے فارغ التحصیل طلباء کی جیسی مانگ اس نے رکھی ہے۔بس اسی کے اصول پر تربیت بھی ہونی چاہیے۔'طالبِ علم' نہیں 'طالبِ آن بناؤ'۔''

مولوی صاحب نے گفتگو ختم کرنے کا ہاتھ سے اشارہ کر دیا اور وہ آدمی۔۔۔۔کچھ سمجھ میں نہ آنے کا اظہار کرنے کے انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

(۷۵)

لکم دینکم

''**سنو**! تمہاری یہ کھلی بانہیں، اتنا باریک کپڑا کہ زیرِ جامہ اور جسم نظر آئے، اتنا کھلا گریبان کہ چھاتی کی تقسیم تک نظر آئے دیکھ کر خود مجھے حیا آتی ہے۔ایسے میں اگر میں تمہیں اپنی پسند کے طور پر گھر والوں کو پیش کرونگا تو وہ میری محبت کو ہوسِ جنس قرار دیں گے۔پھر میں کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہوں، میری تعلیم کی بنیاد 'الحیا من الایمان' پر ہے۔''

ہماری رہائش، زیبائش، طرز معاملات، گفتگو ہر چیز میں فرق ہے۔فرض کرو اگر تم یہ ساری خلیج پاٹ کر میرے خاندان، گھر اور معاشرے میں جذب ہونے کی کوشش بھی کرو تو میں خود کو احساس ندامت سے کیونکر بچا سکوں گا کہ میں نے ایک آزاد پرندے کے پر کاٹ کر اسے پنجرے میں قید کر دیا۔جس سے میں تو لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن وہ خود خون کے آنسو روتا ہے۔

نہیں! ہم یہ فاصلے نہیں مٹا سکتے۔ہم محبت کرتے ہیں جو جسم کی کثافتوں سے نہیں روح کی لطافتوں سے کی جاتی ہے۔اس جذبے کو جسم کی لذت سے آلودہ اور پرکھ کی کسوٹی سے شرمندہ مت کرو۔ہماری بہتری 'لکم دینکم ولی دین' میں ہے۔۔۔

❁❁❁

(۷۶)

عادی چور

''سر! آپ یقین کریں میں نے کوئی چوری نہیں کی۔اوراب میں باعزت زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

'' تھانیدار کے سامنے کھڑے شخص نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

''تم بھی یقین کرو میں نے تمہیں چوری کے الزام میں نہیں گرفتار کیا ہے بلکہ میں نے تمہیں

تمہارے علاقے کے تھانیدار کی شکایت پر طلب کیا ہے''۔ تھانیدار بولا۔

''لل۔۔۔۔لیکن سر میں نے وہاں بھی۔۔۔۔۔''

''ہاں ہاں تھانیدار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے تم نے وہاں بھی چوری نہیں کی ہے۔لیکن تمہارے متعلق شکایت یہ ہے کہ تم ماضی میں عادی چور رہے ہو۔جبکہ اب تم اپنے علاقے سے بھاگ کر یہاں چھپے ہوئے ہو کیا تمہیں اب کام نہیں کرنا''۔

''جج۔۔۔ جی سروہ۔'' ملزم حیران ہو کر تھانیدار کا منہ تک رہا تھا۔

(۷۷)

اوورٹیک ٹریک

زندگی کے اوورٹیک ٹریک پر گاڑی دوڑانے کیلئے ٹریفک کے کسی اصول کی پابندی لازمی نہیں تھی۔

ہر کوئی اس تیز رفتار ٹریفک پر اپنی گاڑی اسوقت تک دوڑاتا رہتا تھا جب تک کہ اس کے پیچھے آنیوالا اپنی تیز رفتاری سے اسے مجبور نہ کر دیتا کہ وہ یہ ٹریک چھوڑ دے۔

زندگی کے ہائی وے پر ٹریفک تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔حادثات بھی ہوتے رہتے تھے مگر

تیز رفتار، اوورٹیک کرنے والے ٹریک پر درحقیقت ایک جنگ جاری تھی۔

اس ٹریک پر چلنے کا خواہشمند باحوصلہ ہوتا اور چالاکی، ذہانت اور رسک لینے کا جوش لیکر ہی اس ٹریک پر آتا تھا۔

اپنی تیز رفتاری میں وہ ماحول کی آلودگی، شور شرابے کے مضمرات اور اس جیسی کئی ایک احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ہی اس ٹریک پر اپنی گاڑی دوڑا رہا تھا۔

۔۔۔اس بات سے بے خبر کہ اس ٹریک کے آخری سرے پر ایک بڑا سا شگاف پڑ چکا تھا۔

(۷۸)

دفعہ ۱۴۴

''**پاپا** تم کو معلوم ہے؟'' میرے بیٹے نے کسی مدّبر کی طرح مجھ سے سوال کیا۔

''کیا بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔ اور میرا بیٹا مجھے بتانے لگا۔

''پاپا جرمنی کے بنیادی قانون کی شق دو میں لکھا ہے کہ انسان اپنے اظہار خیال کے لئے آزاد ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے اور یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا پاپا!۔'' میرے بیٹے نے پھر مجھ سے سوال کیا۔ ''اب تم بتاؤ کہ تمہارے ملک کے قانون کی

کونسی شق کا تمہیں پتہ ہے؟''

اپنے بیٹے کے اس سوال پر میں چکرا گیا۔

میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر کوئی قانونی شق یاد ہی نہ آ رہی تھی۔جب میرے بیٹے نے بہت ضد کی تو میں نے کہا۔

''اچھا ایک قانونی دفعہ مجھے یاد آ رہی ہے جو ہم اپنے کالج کے زمانے میں خبروں اور اخباروں میں بہت سنا کرتے تھے اور سنا ہے آجکل بھی اس کا بہت چرچا ہے۔۔وہ ہے۔۔۔ دفعہ ایک سو چوالیس۔۔۔۔۔''

(۷۹)

چھوڑ دیا

مولوی صاحب اس کمزور سے شخص پر چڑھے بیٹھے اور مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ منحنی سا شخص اس پہلوان نما مولوی کے نیچے آ کر اپنی جان سے ہاتھ ہی نہ دھو بیٹھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔نہ ہی اپنی کم عمری اور اپنے چھوٹے سے قد کو خاطر میں لایا۔بھاگ کر مولوی صاحب کی گردن میں پیچھے سے لٹک گیا۔اور لگا شور مچانے،

''مولی صاحب مولی صاحب یہ مر جائے گا۔آپ اس پر سے اتر جائیں۔''

شورسن کراورلوگوں کے جمع ہو جانے اورایک بچے کواپنے اوپرسوار دیکھ کرخلجان کے مارے مولوی صاحب نے اس شخص کوچھوڑ دیا۔

نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر میں نے گھر آ کرتمام واقعہ ابوکو بتایااوران کے مشورے پرگھر پرہی نماز پڑھنے لگا۔

اس دن سے میں نے مسجد جانا چھوڑ دیا۔

❁❁❁

(۸۰)

چلا ہوا کارتوس

''اپنی اوقات دیکھ کربات کرو۔۔'' نیلت نے تیزآواز میں کہا۔''تمہیں یہ کہنے کی جُرأت کیسے ہوئی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔۔؟کبھی آئینہ دیکھا ہےتم نے۔''

''مگرتم نےتو خودہی کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔۔۔۔''سہیل گڑگڑاتے ہوئے بولتا رہا۔

''یونیورسٹی کےاسی لان پرہم نے محبت کی قسم کھائی تھی۔دیکھونیلت !اس لان کی فضا،گلوں کی

مہک سب ہی ہمارے پیمان وفا کے گواہ ہیں۔''

''وہ سب کچھ سراب تھا جسے بھول جاؤ تو اچھا ہے۔''نیلت نے بے رخی سے کہا۔

''وہ ڈرامہ میں نے سلیم کو اپنی جانب متوجہ کرنے کیلیئے رچایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم جیسے لڑکے کے ساتھ مجھے دیکھ کر سلیم میں حسد کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ ضرور میری طرف متوجہ ہوگا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں۔''

اتنا کہہ کر نیلت پرس اچھالتے قریب آتے ہوئے سلیم کو ہیلو کہتی ہوئی چلدی۔ دور ہوتے ہوئے سلیم اور نیلت کے قہقہے اسکے کانوں میں کسی پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر رہے تھے جو مدھم ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔

(۸۱)

فرض شناس

ٹیلی فون کے محکمے میں لائین مین ہونے کی وجہ سے اسے اتنی سہولت تو حاصل تھی کہ وہ دنیا کہ جس حصے میں چاہتا پلک جھپکتے پہنچ جاتا۔

لیکن کسی کھمبے پر سے اور کسی بنگلے کے ٹیلیفون کے ذریعہ۔

وہ آج بھی مزے سے اپنے ایک دوست سے امریکہ بات کرر ہا تھا کہ اچانک اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اوپر سے گزرنے والا بجلی کا تار نہ معلوم کس طرح ٹوٹ کر اس پر گرا اور چند لمحوں میں اسے خاکستر کر گیا۔

آناًفاناًسارے شہر میں خبر پھیل گئی۔

اخبارات اس کی تصویر چھاپ رہے تھے۔اس کے پس ماندگان کوتعزیت نامے مل رہے تھے اوراس کے ورثاءکودس ہزارروپے کاانعام اورمعاوضہ دینے کااعلان بھی کردیا گیا۔۔۔۔

اس کی فرض شناسی کوسراہنے کے لئے۔۔۔۔

(۸۲)

بھڑکتی آگ

محلے میں آگ کی خبر، آگ سے زیادہ تیزی سے پھیل گئی۔بچے بوڑھے سب ہی جس حال میں تھے گھر سے باہر نکل پڑے۔

ہرکوئی اپنے تیئں آگ بجھانے میں جٹ گیا۔

مقیم جلدی سے اس گھر کی چھت پر، جس میں آگ لگی تھی چڑھ گیا۔

نیچے سے مقیم کو پانی کی بالٹی بھربھرکراوپر پہنچائی جانے لگی۔

سلمیٰ بھی جس حالت میں تھی پانی کی ایک چھوٹی بالٹی لیے بے خیالی میں دوپٹہ چھوڑ چھاڑ وہاں پہنچ گئی۔

مقیم چھت کے اوپر سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

حسن کا مرقع اور ایسی پریشانی میں لاابالی پن۔۔۔۔۔اس نے آگے بڑھ کر سلمیٰ سے بالٹی پکڑ لی۔

گھر میں لگی آگ جلد ہی بجھ چکی تھی۔مگر ایک آگ اب سلمیٰ اور مقیم کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔

(۸۳)

لگان

'' **منشی** جی جلدی کریں آج سارا حساب کتاب ہوجانا چاہیے میری جانب سے زکوۃ میں واجب الادا رقم آج ہر حال میں جمع ہوجانی چاہیے۔

''حضور!۔'' چوہدری مقبول کے پیچھے سے ایک ہلکی سی آواز ابھری۔

''کیا ہے۔'' چودھری چلاّیا۔

''حضور ایک کسان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

’’کیوں؟۔‘‘چودھری پیر پٹختے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

’’لگان توتمہیں دیناہی ہوگا۔‘‘ چودھری زوردے کر بولا۔

’’سرکار میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں انہیں کہاں سے کھلاؤنگا۔کچھ توغریب پررحم کیجئے۔‘‘ کسان گڑگڑاتارہا۔

’’ارےتم اس کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے مدد کیوں نہیں لے لیتے۔۔!‘‘

(۸۴)

کہانی کا قتل

طلاق توتم نے اس کودے ہی دی ہے پھر کہانی سے ملنے کی وجہ۔۔۔اس کے چہرے سے ناراضگی چھلک رہی تھی۔۔۔۔اپنے دوست سے اس نے باتوں ہی باتوں میں اگلوالیا کہ آج وہ کہانی کے ساتھ کہیں باہر ڈیٹ پر جارہاہے۔

اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔لیکن اس نے اپنے دوست کے سامنے اپنے غصے کا بالکل اظہارنہیں کیا۔صرف یہ معلوم کرلیا کہ وہ دونوں کہاں مل رہے ہیں۔

جب اس کا دوست،اپنی سابقہ(ایکس) کا نیاعاشق،مقررہ وقت اورمقام پر پہنچاتواسے وہاں ایک ہجوم دیکھ کرحیرانی ہونے لگی۔ابھی وہ کچھ بھی نہ سمجھ پایاتھا کہ ایک پولیس کے سپاہی نے

اسے آگے بڑھ کر ہتھکڑی لگاتے ہوئے کہا۔

’’تمہیں لکھاری اوراس کی سابقہ کہانی کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔‘‘

اس کے سامنے سے کچھ اور سپاہی خون میں لت پت دو لاشیں اٹھائے لیے جا رہے تھے۔

❁❁❁

(۸۵)

پوجا

’’**بیٹا** زادِراہ میں تھوڑی سی دیس کی مٹی بھی لے جا۔ ماں نے بندھے سامان میں ایک اور تھیلا لٹکا دیا۔ ماں اتنی دور کا سفر ہے کتنا بوجھ اٹھاؤ نگا۔‘‘ بیٹے نے ہلکی آواز میں احتجاج کیا۔

’’ارے جب جب ماں کی یاد آئے مٹی کی خوشبو سونگھنا۔‘‘ ماں نے جواب دیا۔

’’اچھا ماں۔‘‘ کہہ کر بیٹا سفر پر ہولیا۔

پردیس میں رہتے جب جب ماں کی یاد آتی وہ ماں کے کہنے کے مطابق مٹی کو سونگھتا۔ ایک دن جب اسے ماں کی یاد نے بہت ستایا تو اس نے مٹی کو نکالا اور پانی سے گوندھ کر اسے مختلف طریقے سے ڈھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور پھر اسے اس نے اپنی ماں کی شکل میں ڈھال دیا۔ مورتی کو تیار کر کے، دھوپ میں رکھا اور جب وہ مورتی تیار ہوگئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اسے لگا جیسے اسے پھر سے اسکی ماں مل گئی ہو۔ اسے طاق پر سجا کر رکھ دیا۔ اب جب بھی ماں کی یاد آتی وہ اسکی پوجا کرتا۔

(۸۶)

انتم سنسکار

اس نے سن رکھا تھا کہ عیدگاہ میں لوگوں کو تنگ کرنے کی خاطر وہ لوگ جنگلی سور لا کر چھوڑ جاتے تھے۔۔۔۔۔تیزی سے پلٹتے حالات سے، وبا کے دنوں میں وہ خاصا محتاط تھا۔عید کی نماز ختم ہوئی مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔۔۔۔اور پھر کیا تھا، بھگدڑ مچ گئی۔۔۔جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر بھاگ نکلا۔۔۔۔اس نے سوچا رک کر دیکھوں تو سہی ہوا کیا ہے۔لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔۔۔کوئی سور سور کے مغلظات نکال تھا۔۔۔تھوڑی بھیڑ چھٹی تو اس نے قریب جا کر دیکھا۔۔۔۔کچھ نا معلوم لوگ اپنے کورونا وائرس سے مر جانے والے افراد کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔۔۔۔استغفار پڑھتے ہوئے وہ رک گیا اور چند ایک لوگوں کے ساتھ مل کر لاشوں کا انتم سنسکار کرنے میں جٹ گیا۔۔۔

(۸۷)

داخلے کی پابندی

جیل کے حکام کا خط پڑھ کر میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔عموماً لوگ تو جیل کی طرف سے موصول ہونے والے خط سے ہی پریشان ہو جاتے ہیں چونکہ انہیں سزا کاٹنے کے لیے بلاوا آتا ہے۔مگر مجھے تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر آپ آئندہ جیل میں داخلے کے وقت تلاشی دینے سے انکار

کریں گے تو آپ پر جیل میں داخلے پر پابندی کا حکم لگا دیا جائے گا۔

''اچھا ہے ایسا ہی حکم لگا دو جیل میں کب اور کون خوشی خوشی آتا ہے، وہ بھی نہیں جو یہاں کام کرتا ہے''۔

میں نے زیرِلب بڑبڑا کر خط کو پھاڑ دیا۔

❁ ❁ ❁

(۸۸)

پدرم سلطان بود

''سر آپ کا آج کا لیکچر بہت ہی خوب تھا۔آپ تو انگریزی اس طرح بولتے ہیں کہ جیسے کوئی اہل زبان بولتا ہو۔آپ اپنی اعجاز بیانی کا راز ہمیں بھی بتائیں گے؟'' لڑکے نے گفتگو ختم کرتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرلیا۔ استاد تمکنت سے بولا۔

''ہوں ! اتنی آسانی سے نہیں آجاتی انگریزی۔ بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔میرے باپ نے گورا صاحب کی خدمت کر کے انگریزی سیکھی تھی اور پھر مجھ تک منتقل کی۔ میرا باپ گورا صاحب کا سائیس تھا۔۔۔''

❁ ❁ ❁

(۸۹)

ہار جیت

''تم ویسے کتنی خراب ہو''۔ لڑکے نے اپنی دوست کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک ہماری تھوڑی سی ان بن کیا ہوگئی کہ تم نے غصے میں جا کر قاضی کو بلا کر کسی دوسرے

شخص سے نکاح کرلیا''۔

''ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو'' لڑکی نے خود پرے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر تم نے اب کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں صرف نکاح ہی نہیں رخصتی بھی کروا کر لوٹونگی''۔

''اچھا سوری بابا'' لڑکے نے ہار مان لی۔

❁ ❁ ❁

(۹۰)

موبی

ہمارا چھوٹا موبی جب سے آیا ہے ہمارے میاں بیوی کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ حالانکہ بات کچھ خاص نہیں۔ ہمارے رشتہ از دواج کے باہم مضبوط ہونے کا باعث ہے تب ہی تو ہم رشتہ موبائل سے منسلک ہو کر اور زیادہ جڑ گئے ہیں۔لیکن یہ قیامت شریر اتنے سے قد پر ہم دونوں کے بیچ آ گیا ہے۔ سوتے جاگتے کھاتے پیتے ہر وقت میرے میاں کی نظروں میں رہتا ہے۔ جبکہ ان کو بھی یہی شکایت ہے کہ یہ میرا چہیتا بن چکا ہے اور اِن سے زیادہ میری نظر التفات اُس پر رہتی ہے۔ ہمارا چھوٹا۔۔۔موبائل فون۔

(۹۱)

ترکیب

انجمن تاجرانِ کتب فروش کی میٹنگ ہورہی تھی۔انجمن کے صدر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جب فلموں پر پابندی لگی۔۔۔اور فلم بینوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تو بیشتر سینما گھروں کے مالکان نے سینما گھروں کوڈھاکر،انہیں کپڑوں کی مارکیٹوں میں بدل ڈالا۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کتابوں کے خریداروں کی کمی اوراس بزنس کے خاتمے پرہمیں کیا ترکیب کرنی چاہیے کہ ہم اپنے آپ کوزندہ رکھ سکیں۔۔۔۔

❁❁❁

(۹۲)

برساتی مینڈک

نہر میں مینڈکوں کی تعداد یکدم بڑھ گئی تھی۔بے شمار مینڈک بہ یک وقت ٹرّاتے تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

منگھوجونہر کے برابر میں باغ میں کام کررہا تھا۔شورشرابے سے تنگ آچکا تھا۔

''کیا کمبخت ہر وقت ٹرّاتے رہتے ہیں ان کے شور سے تو میں تنگ آچکا ہوں۔رات سوتے میں بھی مجھے ان کی آوازیں تنگ کرتی ہیں'' وہ بڑبڑایا۔

❁❁❁

(۹۳)

اندھا دشمن

پولیس نے تشدد کرکے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں تھیں۔
پھر اس کو رہا کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اب شہر میں امن بحال ہو چکا ہے۔
دونوں آنکھوں سے محروم اب وہ دوست دشمن کی تمیز کیے بغیر اندھا دھند فائیرنگ کرتا پھر رہا تھا۔
اب شہر میں کسی کو بھی سکون نہ تھا۔

❁❁❁

(۹۴)

مانگو

ٹی وی کی خبر سنکر میں نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔''وزیر اعظم نے اپنے اتحادی ملک کے سامنے چار ارب ڈالر کی مانگ رکھ دی ہے، ملکی دفاع کے لیے۔''
گھر سے نکل کر میں مسجد آ گیا۔
نماز ختم ہوئی تو مولوی صاحب زور سے بولے، مانگو۔۔۔۔۔۔۔۔
''اللہ تعالی سے مانگ لو جتنا مانگو گے اتنا ملے گا۔'' ❁❁❁

(۹۵)

جنریشن گیپ

زرینہ کو بہت دقت ہورہی تھی اسکا شوہر ناراض ہورہا تھااور وہ یہ کہتے ہوئے شرمارہی تھی کہ دراصل وہ نہارہی تھی۔اس لیےفوراًدروازہ کھولنے نہ آسکی اوراس کےشوہرکو انتظارکرناپڑا۔کوُکی بہت منہ پھٹ واقع ہوئی تھی وہ زرینہ کی پڑپوتی تھی اور ہر بات کہہ جاتی تھی۔ایک دن وہ شوہر سے ناراض ہوکر بولی ’’تم بہت کاہل اور نکھے ہوتم کو یاد ہےہم نے آخری دفعہ کب سیکس کیا تھا‘‘

(۹۶)

لاک ڈاوٗن

فارماسوٹیکل کمپنی کا عالمی اجلاس ڈبلیوایچ اوکی سربراہی میں ہورہا تھا۔تمام دنیا کے ماہرادویات جمع تھے۔زیربحث یہ بات تھی کہ صرف جنگی سازوسامان بنانے والی کمپنیاں کیوں منافع کمارہی ہیں۔ایک منخنی ساسائنسداں اٹھ کرکھڑاہوااور بولا"میرانام کوڈ19 ہے۔ میرے پاس اس کاحل ہے۔" سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔۔۔۔۔

(۹۷)

ضمیر کی صفائی

تم نے یقیناً اتنے زیادہ گناہ کیے ہیں جب ہی تمہیں تمہارے ضمیر کی ملامت اتنی زیادہ عبادت پر اکساتی ہے۔ ورنہ ایک عام آدمی کو تو انسان بننے کے لیے اتنی ہی عبادت کافی ہوتی ہے جتنی عبادت اس پر فرض کی گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

(۹۸)

ادلا بدلا

''**بچوں** کو ہم نے کنڈر گارٹن میں داخل کرا دیا تھا۔صبح آٹھ بجے سے شام کے پانچ بجے تک وہ مزے سے کنڈر گارٹن میں رہتے تھے۔۔۔۔۔

جب ہم بوڑھے ہو گئے تو وہ ہمیں اولڈ ہائیم چھوڑ آئے۔

(۹۹)

نفسیاتی معاملہ

''**یار میں** کیا کروں! جب میری نگاہ کسی خوبصورت چہرے پر پڑتی ہے بس میری نیت خراب ہوجاتی ہے۔ اور خوبصورت چہرے پر نگاہ پڑنا تو ناگزیں ہے''۔

''لڑکی کتنی ہی سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ڈھکی کیوں نہ ہو۔اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگتی ہے۔اس کے خدوخال۔۔اس کے نشیب وفراز، اوراس کے خطوط ہر چیز کا تصور کیے،اس کے جسم کا طواف کرتے میرا ذہن اس کی عریاں تصویر کا خاکہ تیار کرنے لگتا ہے۔اس کے کپڑے میں چھپے جسم کی ایک ایسی لذت آمیز منظر کشی کرتا ہے کہ نہ پوچھو۔۔۔''

''۔۔۔اور جب کوئی کھلی باہیں۔۔کھلی گریباں اور تنگ وچست لباس والی لڑکی سامنے آجائے تو؟۔۔۔۔میرے سوال پر وہ اپنے تصورات کے سمندر سے غوطہ لگا کر سطع آب پر آیا۔۔۔تو ۔۔۔تو پھر۔۔وہ جواب میں ہکلانے لگا۔۔تو نہ پوچھ میرے یار میری۔۔رال ٹپکنے لگتی ہے۔'' اس نے آخر اپنا جملہ مکمل کر ہی دیا۔

''پھر سن! '' میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔۔۔''یہ رال ٹپکنا بڑی خراب بیماری ہے۔ تجھے یاد ہوگا جب ہم بچپن میں سڑکوں پر جادوئی تماشہ کے ساتھ ساتھ ادویات اور ماجون فروخت کرنے والے سنیاسی اور جادوگر کے میلے میں بڑوں کے درمیان میں گھس جایا کرتے تھے اور وہ سنیاسی ہمیں ایسی ہی بیماریوں کے علاج کے لئے دواؤں کی شیشی دیکھایا کرتا تھا۔ اور ایسے کئی مہلک امراض کا علاج کا پیش کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔یقیناً تجھ پر اسکا بہت برا پڑا

ہے۔ میرا خیال ہے میں کسی تجھے کسی ماہرِ نفسیات کے پاس لے چلوں۔۔۔۔۔۔

(۱۰۰)

نشہ

''ابے طاہر۔۔۔شادی شدہ لڑکی کے پیچھے اپنا وقت مت برباد کر'' عاطف بولا

''ارے میں پیچھے کب۔۔میں تو آگے۔۔طاہر اپنا جملہ مکمل کئے بغیر ہی سیڑھیوں سے چڑھتا اوپری منزل کو چلا گیا۔

شام کو گاڑی نکالتے ہوئے طاہر، عاطف کو پھر بتا رہا تھا۔''دیکھو شادی شدہ لڑکیاں ان غیر شادی شدہ سے کہیں بہتر ہوتی ہیں جو پہلے تو ترساتی رہتی ہیں پھر اگر بارش ہو بھی جائے۔۔مٹی گیلی ہو اور جب تم اس کی سوندھی سوندھی بو سے مست ہو کر کہیں ڈوب جانا چاہو تو وہ تمہیں جگا کر کہتی ہے۔۔۔''ہائے اب میں کیا کروں۔۔۔کیا آپ مجھ سے شادی کرینگے''!

بھائی شادی شدہ ان جھمیلوں میں نہیں ڈالتی۔۔مان گئی تو کہے گی ''اچھا فلیٹ کی ایک چابی مجھے بھی دے دو تا کہ مجھے انتظار کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے'' اور بس۔

لل۔۔لیکن عاطف گہری سوچ میں بولا۔''لڑکی کبھی بھی دو مردوں کو لیکر ساتھ ساتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔جلد یا بدیر وہ ایک سے طلاق لے لیتی ہے اور دوسرے کو شادی پر مجبور۔۔۔اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر جانتے ہو طاہر کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ایکدن اسکا شوہر اپنی بیوی اور اس کے محبوب

کوسوتے میں ،موت کی نیند سلا کر چمپت ہو جا تا ہے۔ ویسے کبھی کبھی لڑکی کے محبوب کو ہارٹ اٹیک بھی ہو جا تا ہے۔اورمیاں بیوی راضی ہوجاتے ہیں۔۔۔''

'' یہ تو ہے! '' طاہر نے ونڈ اسکرین پرنظریں جمائے کہیں دور سے کہا۔۔'' یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شوہر بیوی کو گولی مار کر خودکشی کر لے۔۔۔۔۔''اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی اور اسکا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔۔۔۔

مصنف کا تعارف:

نام : سید سرور ظہیر

قلمی نام : **سرور غزالی**

والدہ : سیدہ انیقہ بیگم

والد : سید اظہر الدین احمد

تاریخ پیدائش : یکم جنوری سن 1962

مقام پیدائش : کراچی ر پاکسی

تعلق : بہار گیا شہر، دادا مرحوم کا تعلق بہپورہ سے

تعلیم: بی ایس سی کراچی، ایم ای برلن،
ایم اے اردو جرمن ترجمان، شعبہ سوشل سائینسز،
کارلس روئے، جرمنی

پیشہ : مترجم اردو جرمن

تدریس : لکچرر اردو، ہمبولڈ یونیورسٹی برلن، شعبہ ایشیائی و افریقی اسٹڈیز

معتمد خاص بزم ادب برلن، سابق مدیر کاوش آن لائن

جرمنی آمد : 20 دسمبر سن1981

مصنف کی دیگر کتابیں:

۱۔	''بکھرے پتے''	افسانوں کا مجموعہ	سنِ اشاعت 2008
۲۔	''دوسری ہجرت''	ناول	سنِ اشاعت 2013
۳۔	''بھیگے پل''	افسانوں کا مجموعہ	سنِ اشاعت 2016
۴۔	''میرے مضامین''	مجموعہ مضامین	سنِ اشاعت 2017
۵۔	''سورج کا اغوا''	افسانوں کا مجموعہ	سنِ اشاعت 2019
۶۔	''شب ہجراں''	ناول	سنِ اشاعت 2021
۷۔	''خون کی بھیک''	جرمن زبان میں ناول	سنِ اشاعت 2021
۸۔	ہاراہواملاح	افسانچے	سنِ اشاعت2022

۹۔ ''خوف میں گھرا انسان'' سندھی زبان میں افسانوں کا ترجمہ

ترجمہ: مجیب اوٹو سنِ اشاعت2020

۱۰۔ برصغیر کے اردو افسانے بنگلہ زبان میں منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجمے

ترجمہ: محمد ہیکل ہاشمی۔ڈھاکہ سنِ اشاعت2021

زیرِطبع:

سفر ہے شرط سفرنامے

پابندِ سلاسل شعری مجموعہ

☆☆☆